دیوانِ ساغر صدیقی

ساغر صدیقی





خزاں کی آغوش کا پروردہ جسے بہاروں کے سورج نے سلام کیا۔

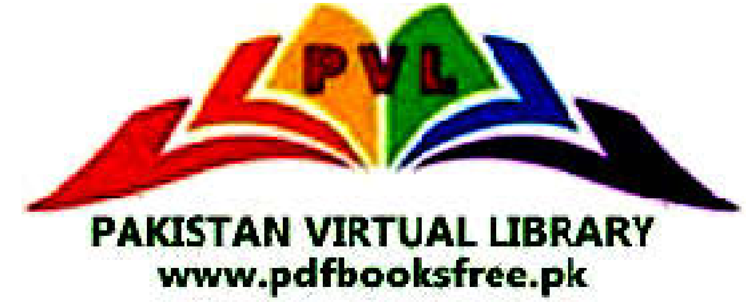
دیوانِ ساغر صدّیقی



خیّام پبلشرز
چوک اُردو بازار ——— لاہور

بار اوّل : فروری ۱۹۹۰ء
تعداد : ۱۱۰۰
ناشر : عبدالرّشید
باہتمام : راشد محمود
مطبع : منظور پرنٹنگ پریس
قیمت : 30/-

سٹاکسٹ:
صابری دارالکتب
قذافی مارکیٹ اُردو بازار۔ لاہور
Phone : 320310



ترتیب

(ڈاکٹر) مالک رام ایم اے، پی۔ایچ۔ڈی

ساغر صدیقی

ساغر صدیقی نے ایک مرتبہ کہا تھا:

"میری ماں دلّی کی تھی، باپ پٹیالے کا، پیدا امرتسر میں ہوا، زندگی لاہور میں گزری! میں بھی عجیب چُوں چُوں کا مربہ ہوں۔"

اس قول میں صرف ایک معمولی سی غلطی کے سوائے اور سب سچ ہے۔ اصل ان کا خاندان انبالے کا تھا اور وہ پیدا بھی انبالے میں ہوئے۔ سال ۱۹۲۸ء تھا۔ گھر میں ہر طرف افلاس و نکبت کا دور دورہ تھا۔ ایسے میں تعلیم کا کیا سوال! محلے میں ایک بزرگ حبیب حسن رہتے تھے، انہیں کے پاس جانے آنے لگے۔ جو کچھ پڑھا انہیں سے اس کے بعد شاید ورنیکلر مڈل کے کچھ درجے بھی پاس کر لئے ہوں۔ ایک دن انہوں نے اس ماحول سے تنگ آ کر امرتسر کی راہ لی اور یہاں ہال بازار میں ایک دوکاندار کے وہاں ملازم ہو گئے جو لکڑی کی کنگھیاں بنا کر فروخت کرتا تھا۔ انہوں نے بھی یہ کام سیکھ لیا۔ دن بھر کنگھیاں بناتے اور رات کو اسی دوکان کے کسی گوشے میں پڑے رہتے۔ لیکن شعر وہ اس ۱۴، ۱۵ برس کی عمر ہی میں کہنے لگے تھے اور اپنے بے تکلف دوستوں کی محفل میں سناتے بھی تھے۔ شروع میں تخلص ناصر حجازی تھا لیکن جلد ہی اسے چھوڑ کر

ساغر صدیقی ہو گئے۔

ساغر کی شہرت ۱۹۴۴ء میں ہوئی۔ اس سال امرتسر میں ایک اچھے بڑے پیمانے پر مشاعرہ قرار پایا۔ اس میں شرکت کے لئے لاہور کے بعض شاعر بھی مدعو تھے۔ ان میں سے ایک صاحب کو معلوم ہوا کہ یہ لڑکا، (ساغر صدیقی) بھی شعر کہتا ہے۔ انہوں نے منتظمین سے کہہ کر اسے مشاعرے میں پڑھنے کا موقع دلوا دیا۔ ساغر کی آواز میں بلا کا سوز تھا اور وہ ترنم سے پڑھنے میں جواب نہیں رکھتا تھا۔ بعد پھر کیا تھا، اس شب اس نے صحیح معنوں میں مشاعرہ لوٹ لیا۔

قدرتاً اس کے بعد امرتسر اور لاہور کے مشاعروں میں اس کی مانگ بڑھ گئی۔ اب اس نے کنگھیاں بنانے کا کام چھوڑ دیا اور بعض سرپرست احباب کی مدد سے اپنا علم اور صلاحیت بڑھانے کی کوشش کی۔ مشاعروں میں شرکت کے باعث اتنی یافت ہو جاتی تھی کہ اسے اپنا پیٹ پالنے کے لئے مزید تگ و دو کی ضرورت نہ رہی۔ گھر والے بے شک ناراض تھے کہ لڑکا آوارہ ہو گیا ہے اور کوئی کام نہیں کرتا۔ لیکن اسے ان کی کیا پروا تھی، اس نے گھر آنا جانا ہی چھوڑ دیا۔ کلام پر اصلاح کے لئے لطیف انور گورداسپوری مرحوم کا انتخاب کیا اور ان سے بہت فیض اُٹھایا۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان بنا، تو وہ امرتسر سے لاہور چلا گیا۔ یہاں دوستوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اُس کا کلام مختلف پرچوں میں چھپنے لگا۔ سینما فلم تیار کرنے والوں نے اس سے گیتوں کی فرمائش کی اور اس میں اسے حیرتناک کامیابی حاصل ہوئی۔ اس دور کی متعدد فلموں کے گیت ساغر کے لکھے ہوئے

ہیں۔ اس زمانے میں اس کے سب سے بڑے سرپرست انور کمال پاشا (ابن حکیم احمد شجاع مرحوم) تھے۔ جو پاکستان میں فلم سازی کی صنعت کے بانیوں میں ہیں۔ انہوں نے اپنی بیشتر فلموں کے گانے ساغر سے لکھوائے اور یہ بہت مقبول ہوئے۔

۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۲ء تک ساغر کی زندگی کا زرّیں دور کہا جاسکتا ہے وہ لاہور کے کئی روزانہ اور ہفتہ وار پرچوں سے منسلک ہوگیا، بلکہ بعض جریدے تو اسی کی ادارت میں شائع ہوتے رہے۔ لیکن اس کے بعد شامتِ اعمال سے حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ وہ کہیں کا نہ رہا اور آخیر میں صحیح معنوں میں مرقعِ عبرت بن گیا۔

۱۹۵۲ء کی بات ہے کہ وہ ایک ادبی ماہنامے کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے سر درد اور اضمحلال کی شکایت کی۔ پاس ہی ایک اور شاعر دوست بھی بیٹھے تھے۔ انہوں نے تعلقِ خاطر کا اظہار کیا اور خاص ہمدردی سے انہیں مارفیا کا ٹیکہ لگا دیا۔ سر درد اور اضمحلال تو دور ہوگیا لیکن اس معمولی واقعے نے ان کے جسم کے اندر نشہ بازی کے تناور درخت کا بیج بو دیا۔ بدقسمتی سے ایک اور واقعے نے اس رجحان کو تقویت دی۔

اس زمانے میں وہ انار کلی لاہور میں ایک دوست کے والد کے (جو پیشہ کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے) مطب کی اوپر کی منزل میں رہتے تھے۔ اسی کمرے میں ان کے ساتھ ایک اور دوست بھی مقیم تھے (اب نام کیا لکھوں) ان صاحب کو ہر طرح کے نشوں کی عادت تھی۔ ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔

ان کی صحبت میں ساغر بھی رفتہ رفتہ اولاً بھنگ اور شراب اور ان سے گزر کر افیون اور چرس کے عادی ہوگئے۔ اگر کوئی شخص راہِ راست سے بھٹک جائے اور توفیق ایزدی اس کی دستگیری نہ کرے، تو پھر اس کا تحت الثریٰ سے ادھر کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔

یہی ساغر کے ساتھ ہوا اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ خود ان کے دوستوں میں سے بیشتر نے ان کے ساتھ ظلم کیا۔ یہ لوگ انہیں چرس کی پڑیا اور مارفیا کے ٹیکے کی شیشیاں دیتے اور ان سے غزلیں اور گیت لے جاتے، اپنے نام سے پڑھتے اور چھپواتے اور بحیثیت شاعر اور گیت کار اپنی شہرت میں اضافہ کرتے۔ اس کے بعد اس نے رسائل و جرائد کے دفتر اور فلموں کے اسٹوڈیو میں جانا آنا چھوڑ دیا۔ اس میں بھی کوئی مبالغہ نہیں کہ اداروں کے کرتا دھرتا اس کے کام کی اجرت کے دس روپے بھی اس وقت تک ادا نہیں کرتے تھے۔ جب تک وہ ان کے درِ دولت کی چوکھٹ پر دس سجدے نہ کرے۔ اس نے ساغر کے مزاج کی تلخی اور دنیا بیزاری اور ہر وقت مبلے خود، رہنے کی خواہش میں اضافہ کیا اور وہ بالکل آوارہ ہوگیا۔ نوبت بایں جا رسید کہ کبھی وہ ننگ دھڑنگ ایک میلی کچیلی چادر اوڑھے اور کبھی چیتھڑوں میں ملبوس، بال بکھرائے ننگے پاؤں ... منہ میں بیڑی یا سگریٹ لئے سڑکوں پر پھرتا رہتا اور رات کو نشے میں دھت مدہوش کہیں کسی سڑک کے کنارے کسی دوکان کے تھڑے یا تختے کے اوپر یا نیچے پڑا رہتا۔

اب اس کی یہ عادت ہوگئی کہ کہیں کوئی اچھے وقتوں کا دوست مل جاتا تو اس سے ایک چوّنی طلب کرتا۔ اس کی یہ چوّنی مانگنے کی عادت سب کو معلوم تھی چنانچہ بارہا ایسا ہوا کہ کسی دوست نے اسے سامنے سے آتے دیکھا اور فوراً جیب سے چوّنی نکال کر ہاتھ میں لے لی۔ پاس پہنچے اور علیک سلیک کے بعد مصافحہ کرتے وقت چوّنی ساغر کے ہاتھ میں چھوڑ دی۔ وہ باغ باغ ہوجاتا۔ یوں شام تک جو دس بیس روپے جمع ہوجاتے، وہ اس دن کے چرس اور مارفیا کے کام آتے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

جنوری ۱۹۷۴ء میں اس پر فالج کا حملہ ہوا اس کا علاج بھی چرس اور مارفیا سے کیا گیا۔ فالج سے تو بہت حد تک نجات مل گئی، لیکن اس سے دایاں ہاتھ ہمیشہ کے لئے بیکار ہوگیا۔ پھر کچھ دن بعد منہ سے خون آنے لگا۔ اور یہ آخر تک دوسرے تیسرے جاری رہا۔ ان دنوں خوراک بالکل برائے نام تھی۔ جسم سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ اب وہ دن دور نہیں جب وہ کسی سے چوّنی نہیں مانگے گا۔ چنانچہ ۱۹ جولائی ۱۹۷۴ء صبح کے وقت اس کی لاش سڑک کے کنارے ملی اور دوستوں نے لے جاکر اسے میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کردیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

یزدانی جالندھری نے قطعۂ تاریخِ وفات کہی:

ساغر نے رختِ زیست جہاں سے اٹھالیا
افسردہ اس کے غم میں ہیں یارانِ انجمن

وہ شہریارِ شعر، وہ درویشِ بے ریا
نظمیں تھیں جس کی مظہرِ معراجِ فکر و فن
نعتوں میں جس کی جذبۂ حُبِّ رسول تھا
غزلوں میں جس کی حُسن و جوانی کا بانکپن
یزدانیِ حزیں نے لبِ جام رکھ کے ہاتھ
تاریخِ رحلت اس کی کہی "ساغرِ سخن"

اس نے غزل، نظم، قطعہ، رباعی ہر صنفِ سخن میں خاصا ذخیرہ چھوڑا ہے وہ خود تو اسے کیا چھپواتا، ناشروں نے اپنے نفع کی خاطر اسے چھاپ لیا اور اسے معاوضے میں ایک حبّہ تک نہ دیا۔ چھ مجموعے اس کی زندگی میں لاہور سے چھپے۔ غمِ بہار، زہرآرزو (۱۹۶۴ء) لوحِ جنوں (۱۹۷۱ء) اور سبز گنبد اور شب آگہی (۱۹۷۲ء) یقین ہے کہ اگر کوشش کی جائے تو ایک اور مجموعے کا مواد بآسانی مہیا ہوسکتا ہے۔ ساغر کا کلام بہت جاندار ہے اور زندہ رہنے کا مستحق۔

جی چاہتا ہے کہ یہاں اس کی زندگی کا ایک واقعہ قلم بند کردوں، جس سے مشہور یونانی فلسفی دیوجانس کلبی کی روایت تازہ ہوتی ہے:

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں پاکستان میں فوجی انقلاب میں محمد ایوب (ف: اپریل ۱۹۷۴ء) برسرِ اقتدار آگئے اور تمام سیاسی پارٹیاں اور سیاستداں جن کی باہمی چپقلش اور رسہ کشی سے عوام تنگ آ چکے تھے۔ حرفِ غلط کی طرح فراموش کر دیئے گئے۔ لوگ اس

تبدیلی پر واقعی خوش تھے۔ ساغر نے اسی جذبے کا اظہار ایک نظم میں کیا ہے۔ اس میں ایک مصرع تھا:

کیا ہے صبر جو ہم نے، ہمیں ایوب ملا

یہ نظم جرنیل محمد ایوب کی نظر سے بھی گزری یا گزاری گئی۔ اس کے بعد جب وہ لاہور آئے تو انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ میں اس شاعر سے ملنا چاہتا ہوں جس نے یہ نظم لکھی تھی۔ اب کیا تھا! پولیس اور خفیہ پولیس اور نوکر شاہی کا پورا عملہ حرکت میں آگیا اور ساغر کی تلاش ہونے لگی لیکن صبح سے شام تک کی پوری کوشش کے باوجود وہ ہاتھ نہ لگا۔ اس کا کوئی ٹھور ٹھکانہ تو تھا نہیں، جہاں سے وہ اسے پکڑ لاتے۔ پوچھ گچھ کرتے کرتے سرِ شام پولیس نے اسے پان والے کی دوکان کے سامنے کھڑے دیکھ لیا۔ وہ پان والے سے کہہ رہا تھا کہ پان میں قوام ذرا زیادہ ڈالنا۔ پولیس افسر کی باچھیں کھل گئیں کہ شکر ہے ظلِ سبحانی کے حکم کی تعمیل ہوگئی۔ انہوں نے قریب جاکر ساغر سے کہا کہ آپ کو حضور صدرِ مملکت نے یاد فرمایا ہے۔ ساغر نے کہا:

بابا ہم فقیروں کا صدر سے کیا کام! افسر نے اصرار کیا، ساغر نے انکار کی رٹ نہ چھوڑی۔ افسر بے چارا پریشان کرے تو کیا کیونکہ وہ ساغر کو گرفتار کرکے تو لے نہیں جا سکتا تھا کہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا اور اسے کوئی ایسی ہدایت بھی نہیں ملی تھی جرنیل صاحب تو محض اس سے ملنے کے خواہشمند تھے اور ادھر یہ

"پگلا شاعر" یہ عزت افزائی قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اب افسر نے جو مسلسل خوشامد سے کام لیا، تو ساغر نے زچ ہوکر اس سے کہا:

ارے صاحب، مجھے گورنر ہاؤس میں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ مجھے کیا دیں گے، دوسو چار سو فقیروں کی قیمت اس سے کہیں زیادہ ہے جب وہ اس پر بھی نہ ٹلا تو ساغر نے گلوری کلے میں دبائی اور زمین پر پڑی سگرٹ کی خالی ڈبیہ اٹھا کر اسے کھولا۔ جس سے اس کا اندر کا حصہ نمایاں ہوگیا۔ اتنے میں یہ تماشا دیکھنے کو ادگرد خاصی بھیڑ جمع ہوگئی تھی۔ ساغر نے کسی سے قلم مانگا اور اس کاغذ کے ٹکڑے پر یہ شعر لکھا:

ہم سمجھتے ہیں ذوقِ سلطانی
یہ کھلونوں سے بہل جاتا ہے

ساغر صدیقی بقلم خود

اور وہ پولیس افسر کی طرف بڑھا کر کہا:

یہ صدر صاحب کو دے دینا، وہ سمجھ جائیں گے اور اپنی راہ چلا گیا:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
شاید کہ تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

ایک نغمہ، ایک غنچہ، ایک تارا، ایک جام
اے غمِ دوراں، غمِ دوراں! تجھے میرا سلام
ہم بنائیں گے یہاں ساغرؔ! نئی تصویرِ شوق
ہم تخیل کے مجدد، ہم تصور کے امام

گیت اس عہدِ بے تکلف میں
بربط و چنگ و نے کو ترسے ہیں
ساقیا! تیرے بادہ خانے میں
نام ساغر ہے، مے کو ترسے ہیں

چراغِ طور جلاؤ، بڑا اندھیرا ہے
ذرا نقاب اٹھاؤ بڑا اندھیرا ہے
وہ جن کے ہوتے ہیں خورشید آستینوں میں
انہیں کہیں سے بلاؤ، بڑا اندھیرا ہے
مجھے تمہاری نگاہوں پہ اعتماد نہیں
مرے قریب نہ آؤ، بڑا اندھیرا ہے
فرازِ عرش سے ٹوٹا ہوا کوئی تارا
کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ، بڑا اندھیرا ہے

ابھی تو صبح کے ماتھے کا رنگ کالا ہے
ابھی فریب نہ کھاؤ، بڑا اندھیرا ہے
بصیرتوں پہ اجالوں کا خوف طاری ہے
مجھے یقین دلاؤ، بڑا اندھیرا ہے
جسے زبانِ خرد میں شراب کہتے ہیں
وہ روشنی سی پلاؤ بڑا اندھیرا ہے
بنامِ زہرہ جبینانِ خطۂ فردوس
کسی کرن کو جگاؤ بڑا اندھیرا ہے

ساغر کسی کی یاد میں جب اشکبار تھے
کتنے حسین دن تھے جہانِ خواب میں

جگمگاتے ہیں وحشتوں کے دیار
عقل نے آدمی کو بیچ دیا

ہم اُلٹ دیتے ہیں صدیوں کے نقاب
ہم زمانوں کی خبر رکھتے ہیں

یوں چٹکتے ہیں شاخ پر غنچے
جیسے ان کے سلام آتے ہیں

رہبروں کے ضمیر مجرم ہیں
ہر مسافر یہاں لٹیرا ہے
معبدوں کے چراغ گل کردو
قلبِ انسان میں اندھیرا ہے

میں بھی جنت سے نکالا ہوا اک بت ہی تو ہوں
ذوقِ تخلیق! تجھے کیسے ستم آتے ہیں

ہاں میں نے لہو اپنا گلستاں کو دیا ہے
مجھ کو گل و گلزار پہ تنقید کا حق ہے

صبح دیکھا، شگوفے تھے ٹوٹے ہوئے
گل کھلاتی رہی، رات بھر، چاندنی

اے ستاروں کے چاہنے والے
آنسوؤں کے چراغ حاضر ہیں

رونقِ جشنِ رنگ و بو کے لئے
زخم حاضر ہیں، داغ حاضر ہیں

تشنگی، تشنگی، ارے توبہ!
قطرے قطرے کو ہم ترستے ہیں
اے خداوند کوثر و تسنیم!
تیرے بادل کہاں برستے ہیں؟

کچھ نہیں مدعا فقیروں کا
درد ہے لا دوا فقیروں کا
اپنی تنہائیوں پہ ہنستے ہیں
کون ہے آشنا فقیروں کا

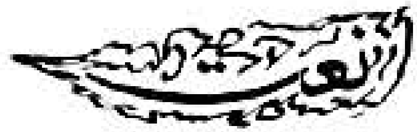
ایک وعدہ ہے کسی کا، جو وفا ہوتا نہیں
ورنہ ان تاروں بھری راتوں میں کیا ہوتا نہیں
ہر شناور کو نہیں ملتا، تلاطم سے خراج
ہر سفینے کا محافظ ناخدا ہوتا نہیں
ہر بھکاری پا نہیں سکتا مقامِ خواجگی
ہر کس و ناکس کو تیرا غم عطا ہوتا نہیں

ہائے یہ بیگانگی، اپنی نہیں مجھ کو خبر!
ہائے یہ عالم کہ تو دل سے جدا ہوتا نہیں

زمانے کو نہ دے الزام، اے ناواقفِ منزل!
زمانے کی نظر ہم ہیں، زمانے کا چلن ہم ہیں

آوارگی بزنگِ تماشا بُری نہیں
ذوقِ نظر ملے، تو یہ دنیا بُری نہیں
کہتے ہیں تیری زلفِ پریشاں کو زندگی
اے دوست! زندگی کی تمنا بُری نہیں
ساغر کے ساتھ چل کے کبھی میکدے میں سُن
آتی حدیثِ ساغر و بادہ بُری نہیں

یاد رکھنا، ہماری تربت کو
قرض ہے تم پہ چار پھولوں کا



بزمِ کونین سجانے کے لئے آپ آئے
شمعِ توحید جلانے کے لئے آپ آئے

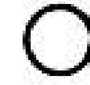
ایک پیغام جو ہر دل میں اُجالا کر دے
ساری دُنیا کو سنانے کے لئے آپ آئے

ایک مدت سے بھٹکتے ہوئے انسانوں کو!
ایک مرکز پہ بُلانے کے لئے آپ آئے

ناخدا بن کے اُبلتے ہوئے طوفانوں میں
کشتیاں پار لگانے کے لئے آپ آئے

قافلہ والے بھٹک جائیں نہ منزل سے کہیں
دُور تک راہ دکھانے کے لئے آپ آئے

چشمِ بیدار کو اسرارِ خُدائی بخشے
سونے والوں کو جگانے کے لئے آپ آئے



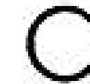
نہ شانِ قیصر و کسریٰ نہ سطوت کے لا
غمِ بشر جسے کہتے ہیں جلد وہ شئے لا

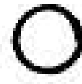
وقارِ لالہ و گُل ہے نہ کیفِ رقصِ صبا!
بہار میں بھی رہا دامنِ چمن پھیلا

جسے تصوّرِ انساں کشید کرتا ہے
شعُور ڈوب کے نکلے نہ جس میں وہ شئے لا

وہ جس کے پاس ہو زخمِ حیات کا مرہم
کہیں سے ڈھونڈ کوئی ایسا چارہ گر ہے لا

درِ سخاوت احساس بند ہے ساغر!
شکستِ کاسۂ مجنوں نہ اب درِ لیلےٰ





تفریق نے جادُو ہی جگایا ہے بلا کا
خطرے میں ہے اے یار! چمن مہر و وفا کا

توہین ہے درویش کا اُس شہر میں جینا!
ہو فاقہ کشی نام جہاں صبر و رضا کا

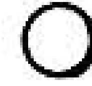
اب تک کا تفکرِ غمِ تقدیر کا چارہ
سینے میں پتہ رکھتے ہیں جو ارض و سما کا

جی چاہتا ہے اے میرے افکار کی مُورت
ملبُوس بنا دوں تجھے تاروں کی رِدا کا!

محفوظ رہیں میرے گُلستاں کی فضائیں
ہو قتلِ گُل و لالہ تقاضہ ہے صبا کا!

جلتے ہوئے دیکھے وہی معصوم شگوفے
تھا جن کو بھروسہ ترے دامن کی ہوا کا

کچھ سرد سی آہیں ہیں تو کچھ ڈوبتے آنسو
ساغرؔ یہ صِلا تجھ کو مِلا سوزِ نوا کا!



فضائے نیم شبی کہہ رہی ہے سب اچھا
ہماری بادہ کشی کہہ رہی ہے سب اچھا

نہ اعتبارِ محبت نہ اختیارِ وفا
جنوں کی تیز روی کہہ رہی ہے سب اچھا

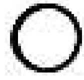
دیارِ ماہ میں تعمیرِ میکدے ہوں گے
کہ دامنوں کی تہی کہہ رہی ہے سب اچھا

قفس میں یوں بھی تسلی بہار نے دی ہے
چٹک کے جیسے کلی کہہ رہی ہے سب اچھا

وہ آشنائے حقیقت نہیں تو کیا غم ہے
حدیثِ نامہ بری کہہ رہی ہے سب اچھا!

تڑپ تڑپ کے شبِ ہجر کاٹنے والو!
نئی سحر کی گھڑی کہہ رہی ہے سب اچھا

حیات و موت کی تفریق کیا کریں ساغرؔ
ہماری شانِ خودی کہہ رہی ہے سب اچھا



تیری نظر کا رنگ بہاروں نے لے لیا
افسردگی کا روپ ترانوں نے لے لیا

جن کو بھری بہار میں غنچے نہ کہہ سکے
وہ واقعہ بھی میرے فسانوں نے لے لیا

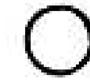
شاید ملے گا قریۂ مہتاب میں سکوں
اہلِ خرد کو ایسے گمانوں نے لے لیا

یزداں سے بچ رہا تھا جلالت کا ایک لفظ
اُس کو حرم کے شوخ بیانوں نے لے لیا

تیری ادا سے ہو نہ سکا جس کا فیصلہ
وہ زندگی کا راز نشانوں نے لے لیا

افسانۂ حیات کی تکمیل ہوگئی!
اپنوں نے لے لیا کہ بیگانوں نے لے لیا

بھولی نہیں وہ قوسِ قزح کی سی صورتیں
ساغر تمہیں تو مست دھیانوں نے لے لیا



اے حسنِ لالہ فام ذرا آنکھ تو ملا!
خالی پڑے ہیں جام ذرا آنکھ تو ملا

کہتے ہیں آنکھ آنکھ سے ملنا ہے بندگی
دنیا کے چھوڑ کام۔ ذرا آنکھ تو ملا

کیا وہ نہ آج آئیں گے تاروں کے ساتھ ساتھ
تنہائیوں کی شام۔ ذرا آنکھ تو ملا!

یہ جام یہ سُبو، یہ تصوّر کی چاندنی
ساقی کہاں مُدام۔ ذرا آنکھ تو ملا!

ساقی مجھے بھی چاہیئے اِک جامِ آرزو!
کتنے لگیں گے دام۔ ذرا آنکھ تو ملا!

پامال ہو نہ جائے ستاروں کی آبرو!
اے میرے خوش خرام۔ ذرا آنکھ تو ملا!

ہیں راہِ کہکشاں میں ازل سے کھڑے ہوئے
ساغر تیرے غلام۔ ذرا آنکھ تو ملا!

میں تلخئ حیات سے گھبرا کے پی گیا
غم کی سیاہ رات سے گھبرا کے پی گیا

اتنی دقیق شے کوئی کیسے سمجھ سکے
یزداں کے واقعات سے گھبرا کے پی گیا

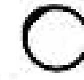
چھلکے ہوئے تھے جام پریشاں تھی زلفِ یار
کچھ ایسے حادثات سے گھبرا کے پی گیا

میں آدمی ہوں، کوئی فرشتہ نہیں حضور
میں آج اپنی ذات سے گھبرا کے پی گیا

دُنیائے حادثات ہے اِک دردناک گیت
دُنیا کے حادثات سے گھبرا کے پی گیا

کانٹے تو خیر کانٹے ہیں ان سے گلہ ہی کیا
پھولوں کی واردات سے گھبرا کے پی گیا

ساغر وہ کہہ رہے تھے کہ پی لیجئے حضور!
اُن کی گزارشات سے گھبرا کے پی گیا



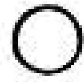
جام پی کر جو دُور تک دیکھا
چشمِ ہستی نے طُور تک دیکھا

یہ شرف آئینے کو حاصل ہے
آئینے نے حضُور تک دیکھا!

چشمِ دیوانہ وار جس کو ملی
اُس نے حدِ شعُور تک دیکھا

اُن کی زُلفوں کا رنگ پایا ہے
جب بھی تخلیقِ نُور تک دیکھا

عجز کی روشنی میں اے ساغر
ہم نے بامِ عرُوج تک دیکھا



آج رُوٹھے ہوئے ساجن کو بہت یاد کیا
اپنے اُجڑے ہوئے گلشن کو بہت یاد کیا

جب کبھی گردشِ تقدیر نے گھیرا ہے ہمیں
گیسوئے یار کی اُلجھن کو بہت یاد کیا

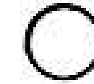
شمع کی جوت پہ جلتے ہوئے پروانوں سے
اِک ترے شعلۂ دامن کو بہت یاد کیا

جس کے ماتھے پہ نئی صبح کا جھومر ہوگا
ہم نے اس وقت کی دُلہن کو بہت یاد کیا

آج ٹوٹے ہوئے سپنوں کی بہت یاد آئی
آج بیتے ہوئے ساون کو بہت یاد کیا

ہم سرِ طُور بھی مایوسِ تجلّی ہی رہے
اُس درِ یار کی چلمن کو بہت یاد کیا

مطمئن ہو ہی گئے دام و قفس میں ساغرؔ
ہم اسیروں نے نشیمن کو بہت یاد کیا



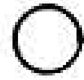
خون یادل سے برستے دیکھا
پھُول کو شاخ پہ ڈستے دیکھا

کتنے بیدار خیالوں کو یہاں
دامِ اخلاص میں پھنستے دیکھا

دِل کا گلشن کہ بیاباں ہی رہا
ایسا اُجڑا کہ نہ بستے دیکھا

کھُل گیا جن پہ مسرت کا بھرم
پھر کبھی ان کو نہ ہنستے دیکھا

اب کہاں اشکِ ندامت ساغرؔ
آستینوں کو ترستے دیکھا



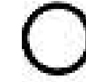
احتیاطاً فقر کا ہر مرحلہ کٹتا رہا
اتفاقاً آپ کی خیرات کا دھڑکا رہا

آج پھر شبنم کے قطروں نے بجایا جلترنگ
آج پھر دامن مری آواز کا بھیگا رہا

کوئی آیا ہے نہ آئے گا دلِ ناداں کبھی
میرے دروازے کا پردہ تو سدا ہلتا رہا

رات کی رانی کا جھونکا تھا کسی کی یاد بھی
دیر تک آنگن مرے احساس کا مہکا رہا

تیز رو چلتے ہیں ساغرؔ قافلے اس نام سے
رہنماؤں سے ہمیشہ راہزن اچھا رہا



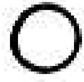
یوں کہ آشفتہ و رُسوا سرِ بازار ہُوا
چاکِ داماں کا تماشہ سرِ بازار ہُوا

تیری عصمت کی تجارت پسِ دیوار سہی
میری تقدیر کا سودا سرِ بازار ہُوا!

پھر کوئی اہلِ جنوں دار پہ چڑھ جائے گا
پھر ترے حُسن کا چرچا سرِ بازار ہُوا

ہم نے رکھا ہے اُسے دِل کے مکاں میں مستور
جو کبھی ہم سے شناسا سرِ بازار ہُوا

مرحلے دید کے دشوار تھے لیکن ساغرؔ
منزلِ طُور کا جلوہ سرِ بازار ہوا!



اے دلِ بے قرار چُپ ہو جا
جا چکی ہے بہار چُپ ہو جا

اب نہ آئیں گے رُوٹھنے والے
دیدۂ اشکبار چُپ ہو جا

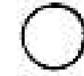
جا چکا کاروانِ لالہ و گُل!
اُڑ رہا ہے غُبار چُپ ہو جا

چھُوٹ جاتی ہے پھُول سے خوشبو
روٹھ جاتے ہیں یار چُپ ہو جا!

ہم فقیروں کا اِس زمانے میں
کون ہے غمگسار چُپ ہو جا!

حادثوں کی نہ آنکھ کھُل جائے
حسرت سوگوار چُپ ہو جا

گیت کی ضرب سے بھی اے ساغرؔ
ٹوٹ جاتے ہیں تار چُپ ہو جا



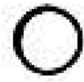
اس درجہ عشق مُوجبِ رُسوائی بن گیا
میں آپ اپنے گھر کا تماشائی بن گیا

دیر و حرم کی راہ سے دل بچ گیا مگر
تیری گلی کے موڑ پہ سودائی بن گیا

بزمِ وفا میں آپ سے اِک پَل کا سامنا
یاد آ گیا تو عہدِ شناسائی بن گیا

بے ساختہ بکھر گئی جلووں کی کائنات
آئینہ ٹوٹ کر تیری انگڑائی بن گیا

دیکھی جو رقص کرتی ہوئی موج زندگی!
میرا خیال وقت کی شہنائی بن گیا



عظمتِ زندگی کو بیچ دیا
ہم نے اپنی خوشی کو بیچ دیا

چشمِ ساقی کے اِک اشارہ پر
عُمر کی تشنگی کو بیچ دیا!

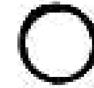
رندِ جام و سبُو پہ ہنستے ہیں
شیخ نے بندگی کو بیچ دیا

راہ گزاروں پہ لُٹ گئی رادھا
شام نے بانسری کو بیچ دیا

جگمگاتے ہیں وحشتوں کے دیار
عقل نے آدمی کو بیچ دیا

لب و رخسار کے عوض ہم نے
سطوتِ خسروی کو بیچ دیا

عشق بھروپیا ہے اے ساغر
روپ نے سادگی کو بیچ دیا



ہر مرحلۂ شوق سے لہرا کے گزر جا
آثارِ تلاطم ہوں تو بل کھا کے گزر جا

بہکی ہوئی مخمور گھٹاؤں کی صدا سن
فردوس کی تدبیر کو بہلا کے گزر جا

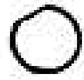
مایوس ہیں احساس کی الجھی ہوئی راہیں
پائل دلِ مجبور کی چھنکا کے گزر جا

یزدان و اہرمن کی حکایات کے بدلے
انساں کی روایات کو دہرا کے گزر جا

کہتی ہیں تجھے میکدۂ وقت کی راہیں
بگڑی ہوئی تقدیر کو سمجھا کے گزر جا

بجھتی ہی نہیں تشنگیٔ دل کسی صورت
اے ابرِ کرم آگ ہی برسا کے گزر جا

کانٹے جو لگیں ہاتھ تو کچھ غم نہیں ساغر
کلیوں کو ہر اک گام پہ بکھرا کے گزر جا



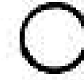
نالہ حدودِ کوئے رسا سے گزر گیا
اب دردِ دل علاج و دوا سے گزر گیا

ان کا خیال بن گئیں سینے کی دھڑکنیں
نغمہ مقامِ صورت و صدا سے گزر گیا

اعجازِ بےخودی ہے کہ یہ حُسنِ بندگی
اِک بُت کی جُستجو میں خُدا سے گزر گیا

انصافِ سیم و زر کی تجلّی نے ڈس لیا
ہر جُرم احتیاجِ سزا سے گزر گیا

اُلجھی تھی عقل و ہوش میں ساغؔر رہِ حیات
یُوں لے کے تیرا نام فنا سے گزر گیا



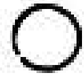
اے حُسنِ لالہ فام ذرا آنکھ تو مِلا
خالی پڑے ہیں جام، ذرا آنکھ تو مِلا

ساقی تجھے بھی چاہیئے اِک زخمِ تشنگی
کتنے لگیں گے دام، ذرا آنکھ تو مِلا

کہتے ہیں آنکھ آنکھ سے مِلنا ہے بندگی
دُنیا کے چھوڑ کام ذرا آنکھ تو مِلا

پامال ہو رہی ہے بہاروں کی زندگی
اے محوِ خوش خرام! ذرا آنکھ تو مِلا

ہیں راہِ کہکشاں میں ازل سے کھڑے ہوئے
ساغؔر تیرے غلام، ذرا آنکھ تو مِلا



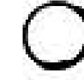
دل مِلا اور غم شناس مِلا
پھُول کو آگ کا لباس مِلا

ہر شناور بھنور میں ڈوبا تھا
جو ستارہ مِلا اُداس مِلا

میکدے کے سوا، ہمارا پتہ
اُن کی زُلفوں کے آس پاس مِلا

مجھ کو تقدیر کی گزرگہ میں
صرف تدبیر کا ہراس مِلا

آبِ حیواں کی دُھوم تھی ساغر
سادہ پانی کا اک گلاس ملا



محفلیں لُٹ گئیں جذبات نے دم توڑ دیا
ساز خاموش ہیں نغمات نے دم توڑ دیا

ہر مسرّت غمِ دیروزہ کا عنوان بنی
وقت کی گود میں لمحات نے دم توڑ دیا

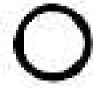
اَن گنت محفلیں محروم چراغاں ہیں ابھی
کون کہتا ہے کہ ظلمات نے دم توڑ دیا

آج پھر بُجھ گئے جل جل کے اُمیدوں کے چراغ
آج پھر تاروں بھری رات نے دم توڑ دیا

جن سے افسانۂ ہستی میں تسلسل تھا کبھی
اُن محبّت کی روایات نے دم توڑ دیا

جھلملاتے ہوئے اشکوں کی لڑی ٹوٹ گئی
جگمگاتی ہوئی برسات نے دم توڑ دیا

ہائے آدابِ محبّت کے تقاضے ساغر
لب ہلے اور شکایات نے دم توڑ دیا



کوئی نالہ یہاں رسا نہ ہُوا
اشک بھی حرفِ مُدّعا نہ ہُوا

تلخیٔ درد ہی مقدّر تھی
جامِ عشرت ہمیں عطا نہ ہُوا

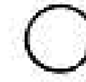
ماہتابی نگاہ والوں سے
دِل کے داغوں کا سامنا نہ ہُوا

آپ رسمِ جفا کے قائل ہوں
میں اسیرِ غمِ وفا نہ ہُوا

وہ شہنشہ نہیں بھکاری ہے
جو فقیروں کا آسرا نہ ہُوا

راہزنِ عقل، ہوش دیوانہ
عشق میں کوئی رہنما نہ ہُوا

ڈوبنے کا خیال تھا ساغرؔ
ہائے ساحل پہ ناخُدا نہ ہُوا



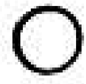
شعلۂ رُخ مست نظر یاد آیا
رشکِ خورشید و قمر یاد آیا

اشک آنکھوں سے چھلکتے ہی رہے
جب کبھی وُہ گُلِ تر یاد آیا

آج کھولی جو بیاضِ غالبؔ
معدنِ لعل و گہر یاد آیا

برق چمکی تو نشیمن دیکھا
شاخ ٹوٹی تو ثمر یاد آیا

چاند کی سمت جو دیکھا ساغرؔ
اپنے ارماں کا سفر یاد آیا



مُضمحل دردِ غم ہے بے چارا
پھر مجھے زندگی نے للکارا

سلطنت ہے قناعتِ درویش
ہر نفس ہے سکندر و دارا!

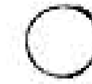
داغ ہیں گُل چمن کے سینے پر
اشک افشاں ہے چشمِ نظارا

چاندنی لُٹ رہی ہے یادوں کی
زخمِ دل ہو گئے ہیں مہ پارا

ترے گیسو خیالوں کی گرفت ناز سے گزرے
کہ جیسے اک جوگی بن میں لہراتا ہے دو تارا

پلٹ آئے ہیں شاید انقلاب دید کے لمحے
نظر کی وسعتوں میں ڈوبتا جاتا ہے نظارا

فقط اک ہات میں ٹوٹا ہوا ساغر اٹھانے کو
لرز اٹھا ہے اے یزداں تری عظمت کا مینارا



اک مدت ہوتی اک زمانہ ہوا
خاک گلشن میں جب آشیانہ ہوا

زلف برہم کی جب سے شناسا ہوئی!
زندگی کا چلن مجرمانہ ہوا

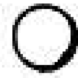
داغ دل کے شہنشہ کے سکے نہیں
دل کا مفلس کدہ کب خزانہ ہوا

راہبر نے پلٹ کر نہ دیکھا کبھی
راہرو ، راستے کا نشانہ ہوا!

ہم جہاں بھی گئے ذوق سجدہ لئے
ہر جگہ آپ کا آستانہ ہوا!

دیکھ مضراب سے خون ٹپکنے لگا
ساز کا تار مرگ ترانہ ہوا

پہلے ہوتی تھی خوئے وفا پروری
اب تو ساغر یہ قصہ پرانا ہوا



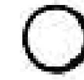
ہر تمنا کا چہرہ عفق خام تھا
وقت کے ہاتھ میں امن کا جام تھا

زندگی کی صراحی میں تھے قہقہے!
ہر ستارہ یہاں میرا مقام تھا

موسمِ گُل میں نغماتِ جلتے رہے
غنچہ غنچہ لئے درد کا جام تھا

یہ بھی دیکھا گلستاں کے آئین میں
صیدِ کا زخمِ صیّاد کا دام تھا

فکرِ ساغر سے زندہ رہی زندگی!
کس قدر سرد احساس کالام تھا



کچھ نہیں مدّعا فقیروں کا
درد ہے لا دوا فقیروں کا

اور تو کچھ نہیں صدا بابا
ہو بھلا کر بھلا فقیروں کا



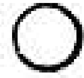
اپنی تنہائیوں پہ ہنستے ہیں
کون ہے آشنا فقیروں کا

منزلوں کی خبر خدا جانے
عشق ہے رہنما فقیروں کا

ایک مُدت سے خالی خالی ہے
کاسۂ اِلتجا، فقیروں کا

میکدے کی حدود میں ہونگے
کیا بتائیں پتہ فقیروں کا

زُلفِ جاناں کی نکہتیں ساغر
بن گئیں آسرا فقیروں کا



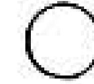
یقین کر کہ یہ کہنہ نظام بدلے گا
مرا شعور۔ مزاجِ عوام بدلے گا

یہ کہہ رہی ہیں فضائیں بہار ہستی کی
نیا طریقِ قفس اور دام بدلے گا

نفس نفس میں شرارے سے کروٹیں لیں گے
دلوں میں جذبۂ محشر خرام بدلے گا

مروّتوں کے جنازے اُٹھائے جائیں گے
سُنا ہے ذوقِ سلام و پیام بدلے گا

دل و نظر کو عطا ہوں گی مستیاں ساغرؔ
یہ بزم ساقی یہ بادہ یہ جام بدلے گا

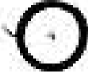


مزاجِ شمع میں کچھ ذوقِ پروانہ بھی ہوتا تھا
کسی کا نام اس محفل میں دیوانہ بھی ہوتا تھا

پریشاں حسرتوں کی بے نقابی دیکھنے والو!
اشاروں پر ہمارے رقصِ پروانہ بھی ہوتا تھا

یقینِ زندگی کو معتبر جس نے کیا ساغرؔ
حقیقت کے صحیفوں میں وہ افسانہ بھی ہوتا ہے

جہاں الفت نبھانے کے حسیں اقرار ہوتے تھے
قریبِ شہرِ یارو ایک ویرانہ بھی ہوتا ہے



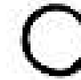
کلیوں کی مہک ہوتا تاروں کی ضیا ہوتا
میں بھی ترے گلشن میں پھولوں کا خدا ہوتا

ہر چیز زمانے کی آئینۂ دل ہوتی!
خاموش محبت کا اتنا تو صلہ ہوتا

تم حالِ پریشاں کی پرسش کیلئے آتے
صحرائے تمنّا میں میلہ سا لگا ہوتا

ہر گام پہ کام آتے زلفوں کے تری سائے
یہ قافلۂ ہستی بے راہنما ہوتا!

احساس کی ڈالی پر اک پھول مہکتا ہے
زلفوں کے لئے تم نے اک روز چنا ہوتا



اِس میں شامل دشت و صحرا اور ویرانے کی بات
اہلِ محفل سے جُدا ہے تیرے دیوانے کی بات

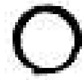
محتسب ہم بہکنا ہوں کو نہ دے الزام مئے
تشنگی میں آگئی ہونٹوں پہ میخانے کی بات

ہاں ابھی بھُولی نہیں جورِ خزاں کی داستاں
احتیاطاً ہم نہیں کرتے بہار آنے کی بات

بن گئی ہے سُرخیِ حسنِ بہارِ جاوداں
آگئی زُلفِ معنبر کے بکھر جانے کی بات

ہر نفس میں شعلہ زن ہیں گرمیاں حالات کی
زندگی ہے ان دنوں بے موت مر جانے کی بات

میکدہ بدلا ہوا ساغر شکستہ حال ہیں
ہر حقیقت بن گئی ہے آج افسانے کی بات



میں التفاتِ یار کا قائل نہیں ہُوں دوست
سونے کے بزم تار کا قائل نہیں ہُوں دوست

مجھ کو خزاں کی ایک لُٹی رات سے ہے پیار
میں رونقِ بہار کا قائل نہیں ہوں دوست

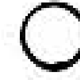
ہر شام وصل ہو نئی تمہیدِ دلبری
اتنا بھی انتظار کا قائل نہیں ہوں دوست

دو چار دن کی بات نہیں زندگی کی بات
دو چار دن کے پیار کا قائل نہیں ہوں دوست

جس کی جھلک سے ماند ہوا اشکوں کی آبرُو
اُس موتیوں کے ہار کا قائل نہیں ہوں دوست

لایا ہُوں بے حساب گُنا ہوں کی ایک فرد
مجبور ہوں شمار کا قائل نہیں ہوں دوست

ساغرؔ بقدرِ ظرف لُٹاتا ہوں نقدِ ہوش
ساقی سے میں اُدھار کا قائل نہیں ہوں دوست



بگڑا جو نقشِ زیست بنا شاہکارِ زیست
ایسے ملے کہ بن گئے پروردگارِ زیست

کچھ اس طرح سے زیست کو اپناؤ دوستو
تا حشر موت کو بھی رہے انتظارِ زیست

دے حادثاتِ نو کی صُراحی سے ایک جام
ساقی کو دو اُترنے لگا ہے خُمارِ زیست

ملاّح کو قبول تھی سُولی رقیب کی!
منصُورِ زیست کے لئے کافی ہے دارِ زیست

اٹکی ہوئی ہے نوکِ مژہ پر لہُو کی بوُند!
کانٹوں میں پل رہی ہے عروسِ بہارِ زیست

لائیں غزل کے شہر سے تشبیہ کے چراغ
اے ہم سخن! چلو کہ سجائیں دیارِ زیست

ساغرؔ کی زندگی پہ کوئی تبصرہ نہ کر
اِک شمع جل رہی ہے سرِ رہگذارِ زیست



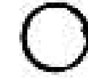
سُوکھ گئے پت جھڑ میں پات
ٹوٹ گئے پھُولوں کے ہات

کتنا نازک ہے یہ دَور
اشکِ گراں، غم کی بُہتات

دشتِ اَلم کی ویرانی میں
کاٹی ہے برکھا کی رات

ہم دیوانے، ہم آوارہ
چل نہ سکو گے اپنے سات

ساغرِ مے خانے میں ہوگا
چھوڑ بھی دو پگلے کی بات



نگاروں کے میلے ستاروں کے جھرمٹ
بہت دلنشیں ہیں بہاروں کے جھرمٹ

جواں ہیں اگر ولولوں کے طلاطم
تو موجوں میں بھی ہیں کناروں کے جھرمٹ

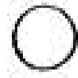
میرے چار تنکوں کی تقدیر دیکھو!
چمن در چمن ہیں شراروں کے جھرمٹ

ترے گیسوؤں سے جنم پا رہے ہیں
گلستاں گلستاں نظاروں کے جھرمٹ

چھلکتا رہا ہے میرا جامِ زریں
جھکتے رہے ہیں چناروں کے جھرمٹ

جہاں جل گئی شمع بزمِ تمنا!
وہیں بل گئے جاں نثاروں کے جھرمٹ

تجھے یاد رکھیں گی ساغر بہاریں!
ترے شعر میں گلعذاروں کے جھرمٹ



زندگی رقص میں ہے جھومتی ناگن کی طرح
دل کے ارمان ہیں بجتی ہوئی جھانجن کی طرح

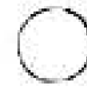
زلفِ رخسار پہ بل کھاتی ہوئی کیا کہنا
اک گھٹا چھائی ہوئی جیسے ہو ساون کی طرح

بحرِ امید میں جب کوئی سہارا نہ ملا!
میں نے ہر موج کو دیکھا ترے دامن کی طرح

جس طرف دیکھئے ٹوٹے ہوئے پیمانے ہیں
اب تو نغمات بھی ہیں نالۂ شیون کی طرح

بارہا گردشِ تقدیر کا عالم دیکھا
گیسوئے یار کی بے نام سی اُلجھن کی طرح

انقلاباتِ بہاراں میں قفس بھی ساغرؔ
میں نے جلتے ہوئے دیکھا ہے نشیمن کی طرح



چاک دامن کو جو دیکھا تو ملا عید کا چاند
اپنی تصویر کہاں بھول گیا عید کا چاند

اُن کے ابروئے خمیدہ کی طرح تیکھا ہے
اپنی آنکھوں میں بڑی دیر چھپا عید کا چاند

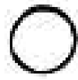
جانے کیوں آپ کے رُخسار مہک اُٹھتے ہیں
جب کبھی کان میں چپکے سے کہا عید کا چاند

دُور ویران بسیرے میں دیا ہو جیسے
غم کی دیوار سے دیکھا تو لگا عید کا چاند

لیکے حالات کے صحراؤں میں آ جاتا ہے
آج بھی خلد کی رنگین فضا عید کا چاند

تلخیاں بڑھ گئیں جب زیست کے پیمانے میں
گھول کر درد کے ماروں نے پیا عید کا چاند

چشم تو وسعتِ افلاک میں کھوئی ساغرؔ
دِل نے اک اور جگہ ڈھونڈ لیا عید کا چاند



غم کی تصویر غزل کے اشعار
خوں کی تحریر غزل کے اشعار

اُن سے تدبیر کی شمعیں روشن
سوزِ تقدیر غزل کے اشعار

داغ کہتے ہیں محبت کے جنہیں
اُن کی تنویر غزل کے اشعار

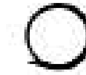
گیسوئے وقت کو سلجھاتے ہیں
درد شبیر غزل کے اشعار

ان میں پیکاں ہیں تری آنکھوں کے
دار و شمشیر غزل کے اشعار

نالہ و شیون و فریاد کی لے
رقصِ زنجیر غزل کے اشعار

اے غمِ یار تصور تیرا!
تیری توقیر غزل کے اشعار

گُل جو کھِلتے ہیں خزاں میں ساغر
اُن کی تفسیر غزل کے اشعار



ہنس نہیں سکتے شگوفے تازگی سے رُوٹھ کر
ہم نہ ملنے میں جیئے ہیں زندگی سے رُوٹھ کر

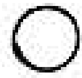
زُلفِ جاناں سے ملی فکر و نظر کی چاندنی
ظلمتیں ہم نے نکھاریں روشنی سے رُوٹھ کر

خود منانے کے لئے آئے مجھے دَیر و حرم
سجدۂ الہام پایا بندگی سے رُوٹھ کر

غم سے رونق ہو گئی کاشانۂ تقدیر میں
مُطمئن ہے دِل کی دُنیا ہر خوشی سے رُوٹھ کر

ایک دن ساقی یہی ٹُوٹے ہوئے جام و سبُو!
میکدے ترتیب دیں گے تشنگی سے رُوٹھ کر

سوچتے ہیں حسرتوں کے موڑ پر شام و سحر
جائیں گے ساغر کہاں اُن کی گلی سے رُوٹھ کر



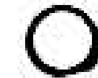
بن گئے اشک جفا کی تصویر
کھِنچ گئی آج صدا کی تصویر

احتیاطِ دلِ عاشق لازم
ٹوٹ جاتی ہے وفا کی تصویر

فصلِ گُل اور چٹکتے غنچے
تیری مخمور ادا کی تصویر

پھر بجا نالہ و شیون کا سُرود
رقص کرتی ہے صبا کی تصویر

بول اُٹھی تری لَے میں ساغر
آسمانوں پہ دُعا کی تصویر



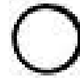
درد کے ماروں پہ ہنستا ہے زمانہ بے خبر
زخمِ ہستی کی کسک سے ہے نشانہ بے خبر

کھیتوں کے سائے میں بکھرے ہوئے ہیں چند پھول
بجلیوں کی یورشوں سے آشیانہ بے خبر

حُسنِ برہم کو نہیں حالِ پریشاں سے غرض
سازِ دل کی دھڑکنوں سے ہے ترانہ بے خبر

دونوں عالم وسعتِ آغوش کی تفسیر ہیں
دیکھنے میں ہے نگاہِ محرمانہ بے خبر

آپ اپنے فن سے ناواقف ہے ساغر کی نظر
لعل و گوہر کی ضیاؤں سے خزانہ بے خبر



ہم بڑی دُور سے آئے ہیں تمہاری خاطر
دل کے ارمان بھی لائے ہیں تمہاری خاطر

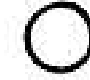
ایسا اک سنگ جو تالیفِ رہِ منزل ہو
منزلوں ڈھونڈ کے آئے ہیں تمہاری خاطر

کتنی ناکام اُمیدوں کے دیئے پچھلے پہر
ہم نے دریا میں بہائے ہیں تمہاری خاطر

عہدِ روشن کے سُخنور نہ بُھلائیں گے کبھی
ہم نے وہ سحر جگائے ہیں تمہاری خاطر

ہم نہ چاہیں گے کبھی تختِ جم و خسرو کے
ہم نے ارمان لٹائے ہیں تمہاری خاطر

ہم وہاں تھے کہ جہاں ساغر و ساقی تھے مُدام
دوستو! لَوٹ کے آئے ہیں تمہاری خاطر



اگرچہ ہم جا رہے ہیں محفل سے نالۂ دلِ فگار بن کر
مگر یقین ہے کہ لوٹ آئیں گے نسخۂ نوبہار بن کر

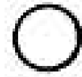
جہان والے ہمارے گیتوں سے جائزہ لیں گے سسکیوں کا
جہان میں پھیل جائیں گے ہم بشر بشر کی پُکار بن کر

بہار کی بدنصیب راتیں بُلا رہی ہیں، چلے بھی آؤ!
کسی ستارے کا رُوپ بن کر، کسی کے دل کا قرار بن کر

ضرورتِ راہ کے مطابق مسافروں نے بھی سیکھ لی ہے
وہ رہبری مُدتوں رہی ہے جو رہبروں کا شکار بن کر

تلاشِ منزل کے مرحلوں میں یہ حادثہ اِک عجیب دیکھا
فریب راہوں میں بیٹھ جاتا ہے صورتِ اعتبار بن کر

یہ کیا قیامت ہے باغبانو! کہ جن کی خاطر بہار آئی
وُہی شگوفے کھٹک رہے ہیں تمہاری آنکھوں میں خار بن کر



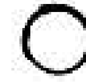
قریبِ دار کٹا دِن تو رات کانٹوں پر
گزار دی ہے کسی نے حیات کانٹوں پر

تغیّرات سے افزوں ہے ارتقاء کا مزاج
مِلا ہے گُل کو چمن میں ثبات کانٹوں پر

بَلا سے دامنِ ہستی جو تار تار ہوا —!
مرے جنوں نے لگائی ہے گھات کانٹوں پر

چٹک رہے ہیں شگوفے تمہاری یادوں کے
سجی ہے شبنم و گل کی برات کانٹوں پر

یہ اور بات ہے پھولوں کا ذکر تھا ساغر
کہ اتفاق سے پہنچی ہے بات کانٹوں پر



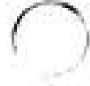
پھول چاہے تھے مگر ہاتھ میں آئے پتھر!
ہم نے آغوشِ محبت میں سلائے پتھر!

وحشتِ دل کے تکلف کی ضرورت کے لئے
آج اُس شوخ نے زلفوں میں سجائے پتھر

اُن کے قدموں کے تلے چاند ستارے دیکھے!
اپنی راہوں میں سلگتے ہوئے پائے پتھر!

میں تری یاد کو یوں دل میں لئے پھرتا ہوں
جیسے فرہاد نے سینے سے لگائے پتھر

فکرِ ساغر کے خریدار نہ بھولیں گے کبھی!
میں نے اشکوں کے گہر تھے جو بنائے پتھر



سکوتِ غم سے جو گزرے نہ پھر ملی آواز
یہیں کہیں اِنہی گلیوں میں کھو گئی آواز

یہ کہکشاں مرے نغمات کی لڑی یارو!
کرن کرن کی سماعت میں ہے مری آواز

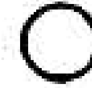
بہت دنوں سے ہے پامال دل کا ہر غنچہ!
میں منتظر ہوں کوئی آئے شبنمی آواز

نہ چھیڑ عذرِ محبت کی داستاں اے دوست
کہ بزمِ عشق میں ہوتی ہے خامشی آواز

میں خود نگہ ہوں کسی موڑ پر نہ ٹھہروں گا
ازل سے دیتی رہی مجھ کو زندگی آواز

شبِ فراق کوئی گنگنا کے گزرا ہے
کہ بن گئی ہے ستاروں کی روشنی آواز

خدا کرے کہ ستاروں کو چھو سکے ساغر
سرودِ زیست کے پردوں میں ڈوبتی آواز



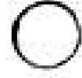
موجزن وقت کے دریا میں نوائے درویش
پدیۂ چاک صدف دستِ دعائے درویش

جب کبھی راستہ حالات کا دھندلایا ہے
کام آئی ہے زمانے میں ضیائے درویش

ہر شگوفے کو چٹکنے کی اجازت دیجئے!
نغمۂ صبحِ بہاراں ہے صلائے درویش

آج اسرارِ شہنشاہی ہیں دیوانوں میں
آج بیدار ہے ذہنوں میں وفائے درویش

ایک ہی چیز کے دو نام ہیں ساغر کے لئے
عزتِ قوم و وطن اور ردائے درویش



خیال ہے کہ بجھا دو یہ روشنی کے چراغ
کہ مستیوں نے جلائے ہیں بیخودی کے چراغ

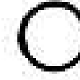
چلو نگاہ کی مشعل کو ساتھ لے کے چلیں
فرازِ شوق پہ روشن ہیں آگہی کے چراغ

روش روش پہ ہراساں ہیں چاند کی کرنیں
قدم قدم پہ سلگتے ہیں بیکسی کے چراغ

مچل رہے ہیں بہت سانپ آستینوں میں
بھڑک رہے ابھی شامِ راستی کے چراغ

چمک رہی ہے لڑی موتیوں کی سینے میں
جلائے کس نے یہ گلہائے شبنمی کے چراغ

اُچھال ساغرِ مے دِل بحال ہوں ساقی
کہ روشنی کو ترستے ہیں زندگی کے چراغ



مانگی ہے اس دیار میں دونوں جہاں کی بھیک
لیکن ملی ہمیں دِلِ ناکامراں کی بھیک

ایسے بھی راہِ زیست میں آئے کئی مقام
مانگی ہے پائے شوق نے عزمِ جواں کی بھیک

بے نُور ہوگئی ہیں ستاروں کی بستیاں
ساقی عطا ہو بادۂ شعلہ فشاں کی بھیک

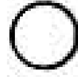
اَب اور کیا تغیرِ تقدیر چاہیئے
جھولی میں ڈال دی ترے نام ونشاں کی بھیک

خود بک گئے حیات کی نیلام گاہ میں
وُہ بانٹتے تھے جو کبھی کون ومکاں کی بھیک

دو چار پتیوں پہ ہے رنجش بہار سے
سائل نے مانگ لی ہے کہاں گلستاں کی بھیک

اللہ اُن کے نقشِ کفِ پا کی خیر ہو!
ذرّوں کو دے گئے جو مہ وکہکشاں کی بھیک

ساغر خوشا کہ گوہرِ اُمید پا لیا
قسمت سے ہات آئی غمِ دوستاں کی بھیک



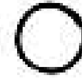
شعلے آنچ دُھواں اور آگ!
اے مرے گلشن کے بھاگ

تیرے گھر میں سیپ اور موتی
میرا حصّہ ریت اور جھاگ

آگ لگا دو! دیدۂ و دِل میں
گاؤ گاؤ دیپک راگ

کوئی نہ آیا ! کوئی نہ آیا!
روز منڈیر سے بولا کاگ

زُلفِ تخیّل سے اے ساغرؔ
کھیل رہے ہیں کالے ناگ



رہگذر کے چراغ ہیں ہم لوگ
آپ اپنا سراغ ہیں ہم لوگ

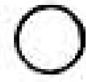
جل رہے ہیں نہ بُجھ رہے ہیں دوست
کس کے سینے کا داغ ہیں ہم لوگ

خود تہی ہیں مگر پلاتے ہیں
میکدے کے ایاغ ہیں ہم لوگ

دشمنوں کو بھی دوست کہتے ہیں
کتنے عالی دماغ ہیں ہم لوگ

چشمِ تحقیر سے نہ دیکھ ہمیں
دامنوں کا فراغ ہیں ہم لوگ

ایک جھونکا نصیب ہے ساغرؔ
اِس گلی کے چراغ ہیں ہم لوگ



کھلتے رہیں گے صحنِ چمن میں ہزار پھُول
لیکن کہاں نصیبِ تمنّا میں چار پھُول

شاید یہیں کہیں ہو ترا نقشِ پائے ناز
ہم نے گرا دیئے ہیں سرِ راہ گزار پھُول

بھونروں کو جستجو ہے تری کُنج کُنج میں
شاخوں پہ کر رہے ہیں ترا انتظار پھُول

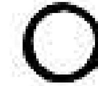
آوارگانِ شوق چلو ہم کریں تلاش
وہ کارواں جو چھوڑ گیا ہے غبارِ پھُول

کانٹوں پہ جی لئے کبھی پھولوں پہ مر لئے
اپنی نظر میں ایک ہیں گلشن میں خار پھول

کھولے ہیں اس نے گیسوئے عنبر فشاں ضرور
کچھ حد سے ہو گئے ہیں سوا اشکبار پھول

ہائے شہیدِ ناز کی تُربت پہ رونقیں
مدھم سی ایک شمع ہے دو سوگوار پھول

ساغرؔ بہار میں نہ رہی مے کی جستجو!
شیشے میں بھر کے پی گیا اِک بادہ خوار پھول

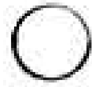


دُکھ درد کے طوفان ہیں آلام کے جنگل
یادیں ہیں تری جیسے کہ آسام کے جنگل

تدبیر ہے تقدیر کی بے نام پرستش
اذہان میں آباد ہیں الہام کے جنگل

پلکوں کے تلے معنیٰ و مفہوم کی جھیلیں
زلفوں کے گھنے سائے ہیں ابہام کے جنگل

ساقی تری مخمور نگاہوں کے سہارے
گلزار کئے ہیں ستمِ ایام کے جنگل



چاندنی اور موتیے کے پھول
کتنے رنگیں ہیں زندگی کے اصول

اپنی زلفیں سمیٹ لیجئے گا
بڑھ رہا ہے کہانیوں کو طول

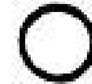
وجہِ تخلیقِ کائنات ہے عشق
واقعے، حادثوں سے ہیں منقول

اے غمِ یار! تیری خیر رہے
اے غمِ یار! ہم نہیں ہیں ملول

میرے دل کی طرح اُداس اُداس
مدّتوں سے ہے شام کا معمول

ان کی چتون کو دیکھ کر برہم
بندگی میں گنہ بھی ہے مشغول

تیرے افکار دل نشیں ساغر
تیرے اشعار زندگی کے رسول



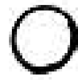
لوگ لے لیتے ہیں یونہی شمع پروانے کا نام
کچھ نہیں ہے اسمیں جہاں غم کے افسانے کا نام

مٹ گئی بربادیٔ دل کی شکایت دوستو
اب گلستان رکھ لیا ہے میں نے ویرانے کا نام

شوخیٔ قدِ نگاراں میری صہبا کا وجود
مستیٔ چشمِ غزالاں میرے پیمانے کا نام

اس کو کہتے ہیں غمِ تقدیر کی نیلام گاہ
ہے زبان تشنگی میں اور میخانے کا نام

دیکھئے ساغر کی آشفتہ نگاہی کا کمال
مستیاں چھلکا رہا ہے ایک دیوانے کا نام



ایک نغمہ، ایک تارا، ایک غنچہ، ایک جام
اے غمِ دوراں - غمِ دوراں تجھے میرا سلام

زلفِ آوارہ، گریباں چاک، گھبراتی نظر
ان دنوں یہ ہے جہاں میں زندگانی کا نظام

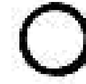
چند تارے ٹوٹ کر دامن میں میرے آ گرے
میں نے پوچھا تھا ستاروں سے ترے غم کا مقام

کہہ رہے ہیں چند بچھڑے راہبروں کے نقشِ پا
ہم کریں گے انقلابِ جستجو کا اہتمام!

پڑ گئیں ہیں پیرہنِ صبحِ چمن پر سلوٹیں
یاد آ کر رہ گئی ہے بیخودی کی ایک شام

تیری عصمت ہو کہ ہو میرے ہُنر کی چاندنی
وقت کے بازار میں ہر چیز کے لگتے ہیں دام

ہم بنائیں گے یہاں ساغرؔ نئی تصویرِ شوق
ہم تخیّل کے مجدّد، ہم تصوّر کے امام



گدا قناعت کو بیچتے ہیں
خدا کی دولت کو بیچتے ہیں

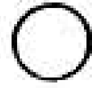
یہ حُسن والے قدم قدم پر
قرار و راحت کو بیچتے ہیں

عجیب ہیں باغباں چمن کے
گلوں کی نکہت کو بیچتے ہیں

وطن میں ایسے بھی رہنما ہیں
مٹے قیادت کو بیچتے ہیں

یہ واعظ پارسا خُدایا!
نری فضیلت کو بیچتے ہیں

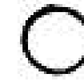
خرد کا لیتے ہیں نام ساغرؔ
جنوں کی عظمت کو بیچتے ہیں



جب گُلستاں میں بہاروں کے قدم آتے ہیں
یاد بھُولے ہوئے یاروں کے کرم آتے ہیں

لوگ جس بزم سے آتے ہیں ستارے لیکر
ہم اُسی بزم سے با دیدۂ نم آتے ہیں

میں وہ اک رندِ خرابات ہوں میخانے میں
میرے سجدے کیلئے ساغرؔ جَم آتے ہیں



پھول مسلیں تو انہیں نغمہ و جھنکار ملیں!
ہم نے کانٹے تو نہیں بوئے کہ انگار ملیں

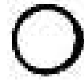
آنکھ لرزاں ہے سرِ محفلِ ہستی اے دوست
اُن کی چلمن کے قریں تشنۂ دیدار ملیں!

اسکو لولاک کی پُر نور زباں کہتے ہیں!
جس میں انسان کی تعظیم کے اطوار ملیں

ایسی مجرُوح تمنّا ہی صلیبِ غم ہے
جس کو غنچے بھی بہاروں میں گرفتار ملیں

خونِ دل شرط ہے اے یارِ بصیرت کیلئے
یہ بھی ممکن ہے کہ صحراؤں میں گلزار ملیں

حیف اُس چارہ گرِ وقت کی قسمت ساغر
جس کو ہر گام پہ تقدیر کے بیمار ملیں

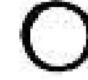


ذرا گیسوئے یار کھولے گئے ہیں
تدبّر کے بازار کھولے گئے ہیں

شگوفوں کے ارماں نچوڑے گئے ہیں
شراروں کے اسرار کھولے گئے ہیں

کئی بار تیری وفاؤں کے عُقدے
سرِ منزلِ دار کھولے گئے ہیں

اُلٹ کر نقابِ رُخِ گُل نگاراں
بہاروں کے دربار کھولے گئے ہیں



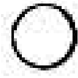
متاعِ کوثر و زمزم کے پیمانے تری آنکھیں
فرشتوں کو بنا دیتی ہیں دیوانے تری آنکھیں

جہانِ رنگ و بو الجھا ہوا ہے انکے ڈوروں میں
لگی ہیں کاکلِ تقدیر سلجھانے تری آنکھیں

اشاروں سے دلوں کو چھیڑ کر اقرار کرتی ہیں
لٹاتی ہیں بہارِ نو کے نذرانے تری آنکھیں

وہ دیوانے زمامِ لالہ و گل تھام لیتے ہیں
جنہیں منسوب کر دیتی ہیں ویرانے تری آنکھیں

شگوفوں کو شراروں کا مچلتا روپ دیتی ہیں
حقیقت کو بنا دیتی ہیں افسانے تری آنکھیں



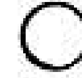
گلوں کے اشارے دعا کر رہے ہیں
چمن کے نظارے دعا کر رہے ہیں

انہیں شب کی تاریکیوں کا الم ہے
چمک کر ستارے دعا کر رہے ہیں

شکستہ سفینوں کو مضبوط کر دے
شگفتہ کنارے دعا کر رہے ہیں

ہمیں صبرِ شبیرؑ سے آشنا کر
کہ اشکوں کے دھارے دعا کر رہے ہیں

رہائی اسیروں کی ہو یا محمدؐ
فدائی تمہارے دعا کر رہے ہیں

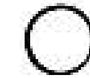


جور و ستم کی رسمیں تقریب بن گئی ہیں
اب بزمِ زندگی میں اہلِ وفا نہیں ہیں

ہر ساز کی نوا پہ پہرے لگے ہوئے ہیں
اس وادیٔ محن میں نغمے روا نہیں ہیں

فاقوں سے زرد چہرے ناکامیوں کے لاشے
یہ لوگ فیض یابِ لطفِ خدا نہیں ہیں!

ساغر میں ہمنوا ہوں نادار و ناتواں کا
حصّہ مرے سخن کا شاہنشہہ نہیں ہیں



ایک وعدہ ہے کسی کا جو وفا ہوتا نہیں
ورنہ ان تاروں بھری راتوں میں کیا ہوتا نہیں

جی میں آتا ہے اُلٹ دیں اُنکے چہرے سے نقاب
حوصلہ کرتے ہیں لیکن حوصلہ ہوتا نہیں!

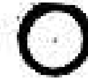
شمع جس کی آبرو پر جان دیدے جھوم کر
وہ پتنگا جل تو جاتا ہے فنا ہوتا نہیں

اب تو مدّت سے رہ و رسمِ نظارہ بند ہے
اب تو اُن کا طور پر بھی سامنا ہوتا نہیں

ہر بھکاری پا نہیں سکتا مقامِ خواجگی
ہر کس و ناکس کو تیرا غم عطا ہوتا نہیں

ہر شناور کو نہیں ملتا تلاطم سے خراج
ہر سفینے کا محافظ، ناخُدا ہوتا نہیں

بارہا دیکھا ہے ساغر رہگذارِ عشق میں
کارواں کے ساتھ اکثر رہنما ہوتا نہیں



بَرِ مقتل، ہمیں نغمات کی تعلیم دیتے ہیں
یہاں اہلِ نظر ظُلمات کی تعلیم دیتے ہیں

یہاں کلیاں مہکتی ہیں مگر خوشبو نہیں ہوتی
شگوفے بَر ملا آفات کی تعلیم دیتے ہیں

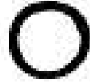
یہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں زرتابی قباؤں میں
سحر کا نام لے کر رات کی تعلیم دیتے ہیں

جنہیں فیضانِ گلشن ہے نہ عرفانِ بہاراں ہے
وُہ پھولوں کو نئے جذبات کی تعلیم دیتے ہیں

رہِ تقدیر اُس دن کیلئے کیا دُھوپ اور سائے
ترے گیسو جنہیں حالات کی تعلیم دیتے ہیں

ہمیں زیبا نہیں دیتا رہِ دُشوار کا منظر
کہ صحراؤں میں بھی برسات کی تعلیم دیتے ہیں

جہاں ساغر شرابِ زندگی اِک زہر قاتل ہے
یقیں والے وہاں خدشات کی تعلیم دیتے ہیں



وَقارِ انجمن، ہم سے فروغِ انجمن، ہم ہیں
سکوتِ شب سے پُوچھو صبح کی پہلی کرن ہم ہیں

ہمیں سے گُلستاں کی بجلیوں کو خاص نسبت ہے
بہاریں جانتی ہیں رُونقِ صحنِ چمن، ہم ہیں

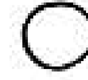
زمانے کو نہ دے الزام اے ناواقفِ منزل
زمانے کی نظر ہم ہیں زمانے کا چلن ہم ہیں

قریب و دُور کی باتیں نظر کا وہم ہیں پیارے
یقینِ رہنما ہم سے فسُونِ راہزن، ہم ہیں

طلوعِ آفتابِ نو ہمارے نام پر ہوگا
وُہ جن کی خاک کے ذرّے ہیں خورشیدِ وطن ہم ہیں

بہر صورت ہماری ذات سے ہیں سلسلے سارے
جنوں کی سادگی ہم ہیں خرد کا بانکپن ہم ہیں

ہمارے ہاتھ میں ہے ساغرِ فردا ادھر دیکھو
ادھر دیکھو! حریفِ گردشِ چرخِ کہن ہم ہیں



تاروں سے میرا جام بھرو! میں نشے میں ہوں
اے ساکنانِ خلد سنو! میں نشے میں ہوں

کچھ پھول کھل رہے ہیں سرِ شاخِ میکدہ
تم ہی ذرا یہ پھول چنو! میں نشے میں ہوں

ٹھہرو! ابھی تو صبح کا تارا ہے ضو فشاں
دیکھو مجھے فریب نہ دو! میں نشے میں ہوں

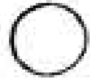
نشہ تو موت ہے غمِ ہستی کی دھوپ میں
بکھرا کے زلف ساتھ چلو! میں نشے میں ہوں

میلا یونہی رہے یہ سرِ رہگذارِ زیست
اب جام سامنے ہی رکھو میں نشے میں ہوں

پائل چھنک رہی ہے نگارِ خیال کی
کچھ اہتمامِ رقص کرو! میں نشے میں ہوں

میں ڈگمگا رہا ہوں بیابانِ ہوش میں
میرے ابھی قریب رہو میں نشے میں ہوں

ہے صرف اک تبسمِ رنگیں بہت مجھے
ساغر بدوش لالہ رخو! میں نشے میں ہوں



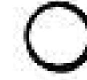
اچھال جام کہ تسخیرِ کائنات کریں
بکھیر زلف کہ تنظیمِ حادثات کریں

شکستِ بازیٔ دوراں ہے ایک جرعۂ مے
چلو کہ بازیٔ دوراں کو آج مات کریں

بُجھا چراغ نظر لُٹ چکی ہے بزمِ خیال
چلو کہ صبح کے تارے سے کوئی بات کریں

رَوش رَوش پہ سجائیں سخن کے گلدستے
بہارِ فکر سے تزئین کائنات کریں

وہ جن کو خوف ہو گردابِ وقت سے ساغرؔ
وہ اپنی ناؤ سپُردِ غمِ حیات کریں



ترے غم کی تلاوت کر رہے ہیں
ستاروں سے شکایت کر رہے ہیں

جُنوں کے تجربوں کی نگہداری
بہ اندازِ فراست کر رہے ہیں

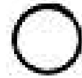
ترے شانوں پہ تابندہ نشاطے
بہاروں کی سخت کر رہے ہیں

نہ دے تہمت ہمیں مدہوشیوں کی
ذرا پی کر عبادت کر رہے ہیں

سحر کے بعد بھی شمعیں جلاؤ!
کہ پروانے شرارت کر رہے ہیں

خداوندانِ گلشن! یہ شگوفے
بہاروں سے بغاوت کر رہے ہیں

مُرتب غم کے افسانوں کو ساغرؔ
بہ اندازِ حکایت کر رہے ہیں



ذرا کچھ اور قربت زیرِ داماں لڑکھڑاتے ہیں
مئے شعلہ فگن پی کر گلستاں لڑکھڑاتے ہیں

تخیل سے گزرتے ہیں تو شبنم کی طرح اُڑ کر
تصوّر میں بہ اندازِ بہاراں لڑکھڑاتے ہیں

تری آنکھوں کے افسانے بھی میخانے ہیں مستی کے
بنامِ ہوش مدہوشی کے عنواں لڑکھڑاتے ہیں

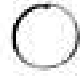
سُنو اے عشق میں توقیرِ ہستی ڈھونڈنے والو!
یہ وہ منزل ہے جس منزل پہ انساں لڑکھڑاتے ہیں

قرارِ دین و دُنیا آپ کی بانہوں میں لرزاں ہے
سہارے دیکھ کر زلفِ پریشاں لڑکھڑاتے ہیں

تمہارا نام لیتا ہوں تو نغمے چونک اُٹھتے ہیں
تمہاری یاد آتی ہے تو ارماں لڑکھڑاتے ہیں

کہیں سے میکدے میں اس طرح کے آدمی لاؤ
کہ جن کی جنبشِ ابرُو سے ایماں لڑکھڑاتے ہیں

چلی آتی ہے خاکِ رہگذر بہرِ پذیرائی
قدم ساغرؔ قریبِ کوئے جاناں لڑکھڑاتے ہیں



ہیں کتنی سازگار زمانے کی تلخیاں
تو ہے تو پُر بہار زمانے کی تلخیاں

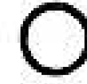
دیکھی ہیں بارہا مری چشمِ شعور نے
انسان کا وقار زمانے کی تلخیاں

جو ہو سکا نہ واقفِ آدابِ میکدہ
کرتا رہا شُمار زمانے کی تلخیاں

تم ساتھ ہو تو جانِ وفا میرے واسطے
پھولوں کی رہگذار زمانے کی تلخیاں

اے رہروِ حیات ذرا جام تو اُٹھا!
بن جائیں گی قرار زمانے کی تلخیاں

ساغرؔ یہی بلندی و پستی کا راز ہیں
تقدیسِ روزگار زمانے کی تلخیاں



دھڑکنیں زندگی کے دامن میں
گیت ہیں بنسری کے دامن میں

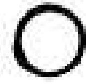
کچھ خطائیں، اگر اجازت ہو!
ڈال دیں بندگی کے دامن میں

آج اُن کو پکار کر کوئی
سو گیا بے خودی کے دامن میں

کچھ شگوفے بہار سے پہلے
گر گئے چاندنی کے دامن میں

میرے اشعار کے قوافی ہیں
جتنے غم ہیں، خوشی کے دامن میں

یاد آئی بہار کی ساغرؔ!
پھول کھلتے، کسی کے دامن میں



بزرگوں کی دعائیں مل رہی ہیں
محبت کو سزائیں مل رہی ہیں

فروزاں ہیں تمہارے غم کے دیپک
بڑی روشن فضائیں مل رہی ہیں

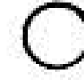
حسیں گیسو ہیں شانوں پر پریشاں
گلے اُن سے گھٹائیں مل رہی ہیں

شعورِ بزم تک جن کو نہیں ہے
اُنہیں رنگیں ادائیں مل رہی ہیں

ترا آنچل ہوا میں اڑ رہا ہے
ترانوں کو نوائیں مل رہی ہیں

چلو بادہ کشوں میں تیرہ بختو!
ستاروں کو ضیائیں مل رہی ہیں

وفاؤں کا صلہ ساغر وطن میں
بہت ارزاں جفائیں مل رہی ہیں



غم کے مجرم خوشی کے مجرم ہیں
لوگ اب زندگی کے مجرم ہیں

اور کوئی گناہ یاد نہیں!
سجدۂ بے خودی کے مجرم ہیں

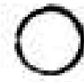
استغاثہ ہے راہ و منزل کا!
راہزن رہبری کے مجرم ہیں

مے کدے میں یہ شور کیسا ہے
بادہ کش بندگی کے مجرم ہیں

دشمنی آپ کی عنایت ہے
ہم فقط دوستی کے مجرم ہیں

ہم فقیروں کی صورتوں پہ نہ جا!
خدمتِ آدمی کے مجرم ہیں!

کچھ غزالانِ آگہی ساغر
نغمہ و شاعری کے مجرم ہیں



ہر تمنا کا لہو کرتے چلیں
احترامِ رنگ و بو کرتے چلیں

بے خودی کی نذر کر دیں زندگی
بیعتِ جام و سبو کرتے چلیں

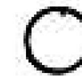
جس زباں میں بےکسوں کی بات ہو!
اس زباں میں گفتگو کرتے چلیں

یہ گھٹاؤں سے برستی مستیاں!
گر اجازت ہو وضو کرتے چلیں

انقلابِ دیدہ و دل کے لئے
آئینوں کو رُو برو کرتے چلیں

کھو کے کچھ پانا یہاں دشوار ہے
احتیاطاً جستجو کرتے چلیں

فکرِ ساغرؔ کی اداؤں میں بیاں!
داستانِ آرزو کرتے چلیں



متاعِ دِل سے خالی ہوگئے ہیں
ترے دَر کے سوالی ہوگئے ہیں

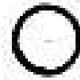
نظر مجروح نظاروں سے دیکھی
حوادث کچھ خیالی ہوگئے ہیں!

چلو اے بُلبلو اس گلستاں سے
یہاں صیّاد مالی ہوگئے ہیں

تمہارے گیسوؤں کی تیرگی سے
اندھیرے بھی جمالی ہوگئے ہیں!

ہمارے داغِ دل کے ترجماں ہیں
سِتارے میرؔ و حالیؔ ہوگئے ہیں!

ہزاروں وَلوَلے ساغرؔ چمن میں
خزاں کی خشک ڈالی ہوگئے ہیں



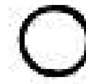
سوچیے مَے کشی کے بارے میں
صورتِ زندگی کے بارے میں

مشورہ ہو رہا ہے تاروں میں
دیدۂ شبنمی کے بارے میں

آپ سے کچھ ہمیں شکایت ہے
زُلف کی برہمی کے بارے میں

لوگ دیوانے ہو ہی جاتے ہیں
سوچ کر آگہی کے بارے میں

چھوڑ رُوداد ساغر و مینا
بات کر تشنگی کے بارے میں



وُسعتِ گیسوئے جاناں سے اُلجھ بیٹھے ہیں
صُورتِ گردشِ دوراں سے اُلجھ بیٹھے ہیں

مدحتِ بادۂ انگور کی خاطر ساقی
رِند اک صاحبِ ایماں سے اُلجھ بیٹھے ہیں

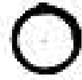
چند نغمے جو مرے سازِ جنوں نے چھیڑے
مستیٔ چشمِ غزالاں سے اُلجھ بیٹھے ہیں!

آج گمنامیٔ احساس کا پرچم لے کر
آدمی شہرتِ یزداں سے اُلجھ بیٹھے ہیں

ایسے کچھ لوگ جنہیں صاحبِ اخلاص کہیں
پھر مرے حالِ پریشاں سے اُلجھ بیٹھے ہیں

نکہتیں صحنِ گلستاں سے خبر لائی ہیں!
پھول آدابِ گلستاں سے اُلجھ بیٹھے ہیں

کچھ پتنگے کہ عطا ہے جنہیں شعلوں کا مزاج
رونقِ شامِ غریباں سے اُلجھ بیٹھے ہیں



آزادیوں کے نام پہ رُسوائیاں ملیں
مشکل سے تیرے درد کی پہنائیاں ملیں

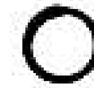
ساقی نے جھوٹ بولا ہے فصلِ بہار کا
گلشن میں صرف آپ کی انگڑائیاں ملیں

تجھ کو ملے ہیں قریۂ مہتاب میں گڑھے
تجھ کو تو پتھروں میں بھی رعنائیاں ملیں

ہم نے اُنہیں کو صُورتِ جاناں بنالیا
دیوارِ آرزو پہ جو پرچھائیاں ملیں

اُن پر نثار محفلِ ہستی کی رونقیں
اے دوست میکدے میں جو تنہائیاں ملیں

ہر تجربے میں ساغرِ مے کا جواز ہے
ہر فلسفے میں زُلف کی گہرائیاں ملیں



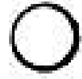
آلام کی یورش میں بھی خورسند رہے ہیں
نیرنگیٔ حالات کے پابند رہے ہیں

آفاق میں گونجی ہے مری شعلہ نوائی
نالے مِرے افلاک کا پیوند رہے ہیں

ڈالی ہیں ترے خاک نشینوں نے کمندیں
ہر چند محلات کے دربند رہے ہیں

ہر دور میں دیکھا ہے مری فکرِ رسا نے
کچھ لوگ زمانے کے خداوند رہے ہیں

ساغرؔ نہ ملی منزلِ مقصود خرد کو
ہاں قافلہ سالارِ جنوں مند رہے ہیں!



ہر تمنّا کو لہو کرتے چلیں!
احترامِ رنگ و بو کرتے چلیں

بیخودی کی نذر کر دیں زندگی
بیعتِ جام و سبو کرتے چلیں

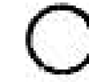
جس زباں میں بیکسوں کی بات ہو
اُس زباں میں گفتگو کرتے چلیں

یہ گھٹاؤں سے برستی مستیاں
گر اجازت ہو وضو کرتے چلیں

انقلابِ دیدۂ دل کے لئے
آئینوں کو رُو برو کرتے چلیں

کھو کے کچھ پانا یہاں دشوار ہے
احتیاطاً جستجو کرتے چلیں

فکرِ ساغرؔ کی اداؤں میں بیاں
داستانِ آرزو کرتے چلیں



تیرے دامن کی ہوا مانگتے ہیں
ہم بھی جینے کی دُعا مانگتے ہیں

مُطربو کوئی اَچھُوتا نغمہ
سازِ آہنگ و صدا مانگتے ہیں

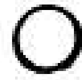
صحنِ کعبہ سے پُجاری چلے
آستینوں میں خُدا مانگتے ہیں!

ماہ و انجم سے جھروکے اکثر
کس کے عارض کی ضیاء مانگتے ہیں

پھر پتنگوں میں خُدائی جاگی
شعلۂ حشر نما مانگتے ہیں

بندہ پرور کوئی خیرات نہیں
ہم وفاؤں کا صِلہ مانگتے ہیں

میکدہ ہو کہ کلیسا ساغرؔ
ساری دنیا کا بھلا مانگتے ہیں



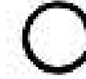
منزلِ غم کی فضاؤں سے لپٹ کر رولوں
تیرے دامن کی ہواؤں سے لپٹ کر رولوں

جامِ مے پینے سے پہلے مرا جی چاہتا ہے
بکھری زُلفوں کی گھٹاؤں سے لپٹ کر رولوں

زرد غنچوں کی نگاہوں میں نگاہیں ڈالوں
سُرخ پھولوں کی قباؤں سے لپٹ کر رولوں

آنے والے ترے رستے میں بچھاؤں آنکھیں
جانے والے ترے پاؤں سے لپٹ کر رولوں

اپنے مجبورِ تقدس کے سہارے ساغر
دیر و کعبہ کے خداؤں سے لپٹ کر رولوں



فریاد کے تقاضے ہیں نغمۂ سخن میں
الفاظ سو گئے ہیں کاغذ کے پیرہن میں

ہر آن ڈس رہی ہیں ماضی کی تلخ یادیں
محسوس کر رہا ہوں بے چارگی وطن میں

ٹکڑا کوئی عطا ہوا حرامِ بندگی کا
سوراخ پڑ گئے ہیں اخلاص کے کفن میں

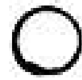
اے پاسبانِ گلشن تجھ کو خبر نہیں ہے
شعلے بھڑک رہے ہیں پھولوں کی انجمن میں

اے یار تیرے غم سے فرصت اگر ملی تو
تبدیلیاں کروں گا اس عالمِ کہن میں

دیکھا ہے میں نے دل کی بیتابیوں کا منظر
اک ٹوٹتی کلی میں اک ڈوبتی کرن میں

اس درجہ دردافشاں غنچوں کی داستاں تھی
کانٹے سے چبھ رہے ہیں احساس کے بدن میں

شاخوں پہ اُنکے ساغر گیسو مہک رہے ہیں
ترتیب پا رہی ہیں رنگینیاں چمن میں



ہے دعا یاد مگر حرفِ دعا یاد نہیں
میرے نغمات کو اندازِ نوا یاد نہیں

ہم نے جن کیلئے راہوں میں بچھایا تھا لہو
ہم سے کہتے ہیں وہی عہدِ وفا یاد نہیں

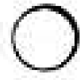
زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

میں نے پلکوں سے درِ یار پہ دستک دی ہے
میں وہ سائل ہوں جسے کوئی صدا یاد نہیں

کیسے بھر آئیں سرِ شام کسی کی آنکھیں
کیسے تھرّائی چراغوں کی ضیا یاد نہیں

صرف دھندلائے ستاروں کی چمک دیکھی ہے
کب ہوا کون ہوا مجھ سے خفا یاد نہیں

آؤ اک سجدہ کریں عالمِ مدہوشی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں



چھپائے دل میں غموں کا جہان بیٹھے ہیں
تمہاری بزم میں ہم بے زبان بیٹھے ہیں

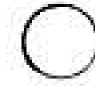
یہ اور بات کہ منزل پہ ہم پہنچ نہ سکے
مگر یہ کم ہے کہ راہوں کو چھان بیٹھے ہیں

فغاں ہے، درد ہے، سوز و فراق و داغِ الم
ابھی تو گھر میں بہت مہربان بیٹھے ہیں

اب اور گردشِ تقدیر کیا ستائے گی
لٹا کے عشق میں نام و نشان بیٹھے ہیں

وہ ایک لفظ محبت ہی دل کا دشمن ہے
جسے شریعتِ احساس مان بیٹھے ہیں

ہے میکدے کی بہاروں سے دوستی ساغر
ورائے حدِ یقین و گمان بیٹھے ہیں



بھنور آنے کو ہے اَے اہلِ کشتی ناخدا چُن لیں
چٹانوں سے جو ٹکرائے وہ ساحل آشنا چُن لیں

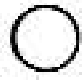
زمانہ کہہ رہا ہے میں نئی کروٹ بدلتا ہُوں
انوکھی منزلیں ہیں کچھ نرالے رہنما چُن لیں

اگر شمس و قمر کی روشنی پہ کچھ اجارہ ہے
کسی بیدار ماتھے سے کوئی تارِ ضیا چُن لیں

یقیناً اب عوامی عدل کی زنجیر چھنکے گی
یہ بہتر ہے کہ مجُرم خود ہی جرُموں کی سزا چُن لیں

اسیری میں کریں حُسنِ گلستاں کی نگہبانی
قفس میں بیٹھ کر طائر ذرا رنگ فضا چُن لیں

بگولے نکہت گُل کے نمائندے کہاں ساغر
سُنیں جو بات پھُولوں کی وہ ہمرازِ صبا چُن لیں



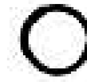
کچھ لوگ بچھا کر کانٹوں کو گُلشن کی توقع رکھتے ہیں
شعلوں کو ہوائیں دے دے کر ساون کی توقع رکھتے ہیں

ماحول کے تپتے صحرا سے حالات کی اُجڑی شاخوں سے
ہم اہلِ جنوں پھُولوں سے بھرے امن کی توقع رکھتے ہیں

جب سارا اثاثہ لُٹ جائے تسکینِ سفر ہو جاتی ہے
ہم راہنماؤں کے بدلے رہزن کی توقع رکھتے ہیں

سنگین چٹانوں سے دل کے دُھکنے کی شکایت کرتے ہیں
ظُلمت کے نگر میں نُورانی آنگن کی توقع رکھتے ہیں

وہ گیسوئے جاناں ہوں ساغر یا گردشِ دوراں کے سائے
اے وائے مقدّر دونوں سے اُلجھن کی توقع رکھتے ہیں



صراحی جام سے ٹکرائیے برسات کے دن ہیں
حدیثِ زندگی دہرائیے برسات کے دن ہیں

سفینہ لے چلا ہے کس مخالف سمت کو ظالم
ذرا ملاح کو سمجھائیے برسات کے دن ہیں

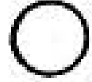
کسی پُر نور تہمت کی ضرورت ہے گھٹاؤں کو
کہیں سے مہوشوں کو لائیے برسات کے دن ہیں

طبیعت گردشِ دوراں کی گھبرائی ہوئی سی ہے
پریشاں زُلف کو سلجھائیے برسات کے دن ہیں

بہاریں ان دنوں وحشتِ بیاباں میں بھی آتی ہیں
فقیروں پر کرم فرمائیے برسات کے دن ہیں

یہ موسم شورشِ جذبات کا مخصوص موسم ہے
دلِ ناداں کو بہلائیے برسات کے دن ہیں

سہانے آنچلوں کے ساز پر اشعار ساغرؔ کے
کسی بے چین دُھن میں گائیے برسات کے دن ہیں



دستور یہاں بھی گونگے ہیں فرمان یہاں بھی اندھے ہیں
اے دوست خدا کا نام نہ لے ایمان یہاں بھی اندھے ہیں

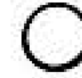
تقدیر کے کالے کمبل میں عظمت کے فسانے لپٹے ہیں
مضمون یہاں بھی بہرے ہیں عنوان یہاں بھی اندھے ہیں

زردار توقع رکھتا ہے نادار کی گاڑھی محنت پر
مزدور یہاں بھی دیوانے ذیشان یہاں بھی اندھے ہیں

کچھ لوگ بھروسہ کرتے ہیں تسبیح کے چلتے دانوں پر
بے چین یہاں یزداں کا جنوں انسان یہاں بھی اندھے ہیں

بے نام جفا کی راہوں پر کچھ خاک سی اُڑتی دیکھی ہے
حیراں ہیں دلوں کے آئینے نادان یہاں بھی اندھے ہیں

بے رنگ شفق سی ڈھلتی ہے بے نُور سویرے ہوتے ہیں
شاعر کا تصوّر بھوکا ہے سلطان یہاں بھی اندھے ہیں



تری دُنیا میں یا رب زیست کے سامان جلتے ہیں
فریبِ زندگی کی آگ میں انسان جلتے ہیں

دِلوں میں عظمتِ توحید کے دیپک فسُردہ ہیں
جبینوں پر ریا و کبر کے فرمان جلتے ہیں

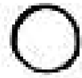
ہوس کی باریابی ہے خود مندوں کی محفل میں
روپہلی ٹکلیوں کی اوٹ میں ایمان جلتے ہیں

حوادث رقص فرما ہیں قیامت مسکراتی ہے
سُنا ہے ناخُدا کے نام سے طوُفان جلتے ہیں

شگوُفے جھُولتے ہیں اس چمن میں بھُوک کے جھُولے
بہاروں میں نشیمن تو بہر عنوان جلتے ہیں

کہیں پازیب کی چھن چھن میں مجبُوری تڑپتی ہے
ریا دم توڑ دیتی ہے، شُہرے دان جلتے ہیں

مناؤ جشنِ مے نوشی، بکھیرو زُلفِ مے خانہ
عبادت سے تو ساغر و بہر کے شیطان جلتے ہیں



زہرِ قاتل ہے آبگینوں میں
سانپ پلتے ہیں آستینوں میں

چند قطرے ہیں خونِ سائل کے
اب شہنشاہ کے خزینوں میں

خیر ہو! آسماں ستاروں کی
جگمگائے ہیں داغ سینوں میں

انقلاب حیات کیا کہئے
آدمی ڈھل گئے مشینوں میں

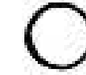
میرے نغموں کا جی نہیں لگتا
ماہ پاروں میں مہ جبینوں میں

جاؤ اہلِ خرد کی محفل میں
کیا کرو گے جنوں نشینوں میں

موج ساحل کو بڑھ کے چوم آئی
ہم تڑپتے رہے سفینوں میں

کچھ فرشتوں کا نام انساں ہے
میرے احساس کے قرینوں میں

اب شراروں کی فصل ہے ساغرؔ
رنگ اُگتے تھے جن زمینوں میں



ایسی تجلیاں ہیں کہاں آفتاب میں
انوارِ خاص ہیں مرے جامِ شراب میں

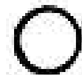
یزداں نے مُسکرا کے بڑی دیر میں لکھا
اِک لفظِ آرزُو مرے دل کی کتاب میں

اب ذوقِ دید میں ہے شعورِ حیاتِ نو
جلووں کو احتیاط سے رکھو کتاب میں

محبوب تیرے حُسن سے غنچوں کی آبرو
خوشبو ترے بدن کی بسی ہے گلاب میں

ہے باغباں کی ترچھی نظر اتنی بات پر
شعلوں کا ذکر آ گیا شبنم کے باب میں

ساغرؔ کسی کی یاد میں جب اشکبار تھے
کتنے حسین دن تھے جہانِ خراب میں



~~دو جہانوں کی خبر رکھتے ہیں~~
بادہ خانوں کی خبر رکھتے ہیں

خار زاروں سے تعلق ہے ہمیں
گلستانوں کی خبر رکھتے ہیں

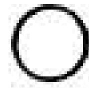
اُن کی گلیوں میں بسر ہوتی ہے
اور مکانوں کی خبر رکھتے ہیں

زخم ہنس ہنس کے جو کھا لیتے ہیں
وہ نشانوں کی خبر رکھتے ہیں

ہم اُلٹ دیتے ہیں صدیوں کے نقاب
ہم زمانوں کی خبر رکھتے ہیں

ہر قدم ذوقِ سفر زندہ ہے
کاروانوں کی خبر رکھتے ہیں

کچھ زمینوں کے ستارے ساغرؔ
آسمانوں کی خبر رکھتے ہیں



پھول جلتے ہیں ہار جلتے ہیں
چاندنی کے مزار جلتے ہیں

اے مصوّر! یہ کیا تماشا ہے
رنگ سے شاہکار جلتے ہیں

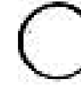
مدّتوں سے ہے سرد مے خانہ
دیر سے مے گسار جلتے ہیں

کچھ پتنگے چراغ کی لَو پر
کتنے بے اختیار جلتے ہیں

تیرے آنچل کی شوخ چھاؤں میں
بے خودی کے دیار جلتے ہیں

روکیے بے قرار کاکل کو
دیکھیے! لالہ زار جلتے ہیں

فکرِ ساغر کی گرمیاں مت پوچھ
اِس چِتا میں نگار جلتے ہیں



ستم جاگتے ہیں، کرم سو رہے ہیں
محبت کے جاہ و حشم سو رہے ہیں

مرے نکتہ سازو! سخن کے خداؤ
پکارو! کہ لوح و قلم سو رہے ہیں

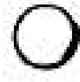
ہر اک ذہن میں ہے خدائی کا دعویٰ
ہر اک آستیں میں صنم سو رہے ہیں

یہاں خوابِ راحت فریبِ یقیں ہے
نہ تم سو رہے ہو نہ ہم سو رہے ہیں

وہاں چاندنی کے قدم ڈولتے ہیں
جہاں تیرے نقشِ قدم سو رہے ہیں

تخیل میں ہیں گیسوؤں کے بہانے
نگاہوں میں رنگیں بھرم سو رہے ہیں

مری اُجڑی اُجڑی سی آنکھوں میں ساغرؔ
زمانے کے رنج و الم سو رہے ہیں



جب تصور میں جام آتے ہیں
آفتابی مقام آتے ہیں

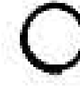
یوں چٹکتے ہیں شاخ پر غنچے
جیسے اُن کے سلام آتے ہیں

دل کی نادانیوں پہ غور نہ کر
کھوٹے سکے بھی کام آتے ہیں

چند لمحات نوجوانی میں
واجب الاحترام آتے ہیں

منزلِ عشق میں خرد والے
صرف دو چار گام آتے ہیں

داستانِ حیات میں ساغر
بے وفاؤں کے نام آتے ہیں



جھوم کر گاؤ میں شرابی ہوں
رقص فرماؤ! میں شرابی ہوں

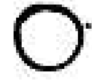
ایک سجدہ بنامِ مے خانہ
دوستو آؤ! میں شرابی ہوں

لوگ کہتے ہیں رات بیت چکی
مجھ کو سمجھاؤ! میں شرابی ہوں

آج ان ریشمی گھٹاؤں کو
یوں نہ بکھراؤ! میں شرابی ہوں

حادثے روز ہوتے رہتے ہیں
بھول بھی جاؤ! میں شرابی ہوں

مجھ پہ ظاہر ہے آپ کا باطن
منہ نہ کھلواؤ! میں شرابی ہوں



چاندنی کو رسول کہتا ہوں
بات کو بااصول کہتا ہوں

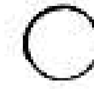
جگمگاتے ہوئے ستاروں کو
تیرے پاؤں کی دھول کہتا ہوں

جو چمن کی حیات کو ڈس لے
اس کلی کو ببول کہتا ہوں

اتفاقاً تمہارے ملنے کو!
زندگی کا حصول کہتا ہوں

آپ کی سانولی سی مُورت کو
ذوقِ یزداں کی بُھول کہتا ہُوں

جب میسّر ہوں ساغر و مینا
برق پاروں کو پھُول کہتا ہُوں



جمالِ انجمن ہم سے، وقارِ انجمن ہم ہیں
سکوتِ شب سے پُوچھو، صبح کی پہلی کرن ہم ہیں

زمانے کو نہ دے الزام، اے ناواقفِ منزل
زمانے کی نظر ہم ہیں، زمانے کا چلن ہم ہیں

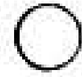
قریب و دُور کی باتیں نظر کا وہم ہے پیارے
یقینِ رہنما ہم سے، فسُونِ راہزن ہم ہیں

ہمیں سے گلستاں کی بجلیوں کو خاص نسبت ہے
بہاریں جانتی ہیں رونقِ صحنِ چمن ہم ہیں

بہر صُورت ہماری ذات سے ہیں سلسلے سارے
جنُوں کی سادگی ہم ہیں، خرد کا بانکپن ہم ہیں

طلوعِ شعلہ و شبنم، ہمارے نام پر ہوگا
وہ جن کی خاک کے ذرّے ہیں خورشیدِ وطن، ہم ہیں

ہمارے سامنے ہے ساغرِ فردا، اِدھر دیکھو!
اِدھر دیکھو! حریفِ گردشِ چرخِ کہن ہم ہیں



دیارِ لالہ و سرو و سمن سے گزُر رہے ہیں
قسم خدا کی تری انجمن سے گزُر رہے ہیں

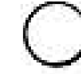
یہ رنگ و بُو جو ترے گیسوؤں کا تلچھٹ ہیں
طلوعِ صبح کی پہلی کرن سے گزُر رہے ہیں

ہزار پھُول کھلے اپنا قافلہ نہ رُکا!
دلوں پہ داغ لئے، ہم چمن سے گزُر رہے ہیں

نہ کوئے یار کی چاہت نہ سوئے دار کی دُھن
کسی کے ابروئے دوراں شکن سے گزرے ہیں

ابھی نہ شمع جلاؤ ہمارے مدفن پر!
کہ زندگی کے اندھیرے وطن سے گزرے ہیں

ہمی سے منزلِ فکر و نظر جواں ساغر
ہمی جو وادیٔ شعر و سخن سے گزرے ہیں



خیالِ یار ہیں ہم پُر بہار رہتے ہیں
خزاں کے دن بھی ہمیں سازگار رہتے ہیں

چمن میں صرف ہمارا ہی ذکر ہوتا ہے
برنگِ لالہ، ہمی داغدار رہتے ہیں

یہ اور بات کہ تم آئے ہو تو کوئی نہیں
وگرنہ غم تو یہاں بیشمار رہتے ہیں

جہانِ قدس بھی میری نظر سے گزرا ہے
وہاں بھی تیری نظر کے شکار رہتے ہیں

بصیرتوں کو نکھارا ہمی نے اے ساغر
تجلیوں سے، ہمی ہمکنار رہتے ہیں



چمن سے برق و شرر سے خطاب کرتا ہوں
شعور فکر و نظر سے خطاب کرتا ہوں

قدم قدم پہ کھلاتا ہوں گُل معانی کے
جہانِ شمس و قمر سے خطاب کرتا ہوں

جبیں پہ سطوتِ الہام کے تقاضے ہیں!
زبانِ قلب و جگر سے خطاب کرتا ہوں!

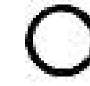
میں ایک مردِ قلندر، میں ایک دیوانہ
طلوعِ نورِ سحر سے خطاب کرتا ہوں

مزاجِ شبنم و لالہ سے بات ہے میری
نگاہِ شعلہ نگر سے خطاب کرتا ہوں

نہ کارواں سے شکایت نہ رہنما سے کلام
غبارِ راہ گزر سے خطاب کرتا ہوں

ہر ایک گام پہ ہیں پتھروں کی دیواریں
سکوتِ اہلِ ہنر سے خطاب کرتا ہوں

بنامِ عظمتِ یزداں کبھی کبھی ساغر
وقارِ حسنِ بشر سے خطاب کرتا ہوں



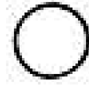
مسکراؤ! بہار کے دن ہیں
گل کھلاؤ! بہار کے دن ہیں

دخترانِ چمن کے قدموں پر
سر جھکاؤ! بہار کے دن ہیں

مے نہیں ہے تو اشکِ غم ہی سہی
پی بھی جاؤ! بہار کے دن ہیں

تم گئے ___ رونقِ بہار گئی!
تم نہ جاؤ بہار کے دن ہیں!

ہاں! کوئی وارداتِ ساغر و مے
کچھ سناؤ! بہار کے دن ہیں!



آوارگی بہ رنگِ تماشا بری نہیں
ذوقِ نظر ملے تو یہ دنیا بری نہیں

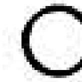
کہتے ہیں تیری زلفِ پریشاں کو زندگی
اے دوست! زندگی کی تمنا بری نہیں

ہے ناخدا کا میری تباہی سے واسطہ
میں جانتا ہوں نیتِ دریا بری نہیں

ذوقِ جنوں کے ساتھ ہے بیداریٔ خرد
شبنم کے ساتھ گرمیٔ شعلہ بُری نہیں

اس رہزنِ حیات زمانے سے دُور چل
مر بھی گئے تو چادرِ صحرا بُری نہیں

ساغر کے ساتھ چل کے کبھی میکدے میں سُن
اپنی حدیثِ بادہ و صہبا بُری نہیں



جلوے مچل رہے ہیں نظاروں کی آگ میں
کچھ پھول جل گئے ہیں بہاروں کی آگ میں

آشفتگی سے چُور ہیں زُلفوں کی بدلیاں
ساقی شراب ڈال چناروں کی آگ میں

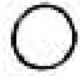
کشتی ہیں ناخدا سے یہ موجوں کی فتنہ نشیں
تیرے بھی مشورے تھے کناروں کی آگ میں

اللہ رے یقینِ محبت کی داستاں
دامن سُلگ رہا ہے ستاروں کی آگ میں

گر مے نہیں تو پیار کے دو بول ہی سہی
کچھ تو کمی ہو بادہ گساروں کی آگ میں

پلکوں پہ بھیگی بھیگی ہیں کجلے کی ڈوریاں
شبنم سُلگ رہی ہے شراروں کی آگ میں

ساغر رہیں گے رونقِ بازارِ آرزو
اشعار جو لکھے ہیں نگاروں کی آگ میں



یہ جو دیوانے سے دو چار نظر آتے ہیں
ان میں کچھ صاحبِ اسرار نظر آتے ہیں

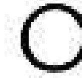
تیری محفل کا بھرم رکھتے ہیں سو جاتے ہیں
ورنہ یہ لوگ تو بیدار نظر آتے ہیں

میرے دامن میں شراروں کے سوا کچھ بھی نہیں
آپ پھولوں کے خریدار نظر آتے ہیں

دُور تک کوئی ستارہ ہے نہ کوئی جگنو
مرگِ اُمید کے آثار نظر آتے ہیں

کل جنہیں چھو نہیں سکتی تھی فرشتوں کی نظر
آج وہ رونقِ بازار نظر آتے ہیں

حشر میں کون گواہی مری دے گا ساغر
سب تمہارے ہی طرفدار نظر آتے ہیں



مِٹ گئیں روشنی میں تحریریں
جل گئیں چاندنی میں تصویریں

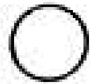
ہائے وُہ تیرے عنبریں گیسو
لے اُڑے زندگی کی تفسیریں

سُرخ کنگن کلائیوں میں ہلے
ہِل گئیں دو جہاں کی تقدیریں

رسمِ فرہاد پھر کریں زندہ
آؤ پھر پتھروں کے دِل چیریں

اے مریضِ الم! تسلّی رکھ
چارہ گر کر رہے ہیں تدبیریں

ہاں اُچھالو حیات کے ساغر
صُبحِ محشر میں اور تاخیریں



اشکِ رواں نہیں ہیں ندامت کے پھول ہیں
رُوٹھے ہوئے بہار سے رحمت کے پھول ہیں

ہیں داغہائے دِل کی شباہت لئے ہوئے
شاید یہی وہ باغِ محبت کے پھول ہیں

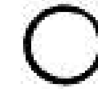
ڈسنے لگی ہیں شاخِ تمنّا کی کونپلیں
رسوائیوں کے خارِ معیشت کے پھول ہیں

رقصاں ہیں رنگ رنگ خیابانِ زندگی
پنہاں کہانیوں میں حقیقت کے پھول ہیں

دیوانگانِ کاکُل ساقی سے مانگیے
وحشت کی وادیوں میں فراست کے پھول ہیں

ایوانِ گلفشاں کے مکینوں ذرا سُنو!
اِن جھونپڑوں میں بھی کہیں فطرت کے پھول ہیں

کہتے ہوئے سنے ہیں سخن آشنائے وقت
ساغر کے شعر بزمِ لطافت کے پھول ہیں



تری نظر کے اشاروں سے کھیل سکتا ہوں
جگر فروز شراروں سے کھیل سکتا ہوں

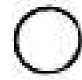
تمہارے دامنِ رنگیں کا آسرا لے کر
چمن کے مست نظاروں سے کھیل سکتا ہوں

کسی کے عہدِ محبت کی یاد باقی ہے
بڑے حسین سہاروں سے کھیل سکتا ہوں

مقامِ ہوش و خرد انتقامِ وحشت ہے
جنوں کی رہگذاروں سے کھیل سکتا ہوں

مجھے خزاں کے بگولے سلام کرتے ہیں
حیا فروش چناروں سے کھیل سکتا ہوں

شراب و شعر کے دریا میں ڈوب کر ساغر،
سرور و کیف کے دھاروں سے کھیل سکتا ہوں



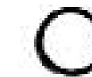
جامِ حالات پُر بہار کرو
بزمِ ہستی کو تابدار کرو

آفتابِ شعور سے یارو!
ذرّہ ذرّہ کرن شعار کرو!

جن سے رسوائیاں ہوں گلشن کی!
اُن شگوفوں کو سنگسار کرو

میں وفائیں تلاش کرتا ہوں
تم جفائیں ذرا شمار کرو!

ذوقِ منصور عام ہے ساغر
اہتمامِ صلیب و دار کرو!!



نہ کشتیوں نہ کناروں کا احترام کرو
فقط بھنور کے اشاروں کا احترام کرو

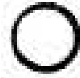
یہیں سے گزرے گا اِک روز کاروانِ بہار
فسُردہ راہگزاروں کا احترام کرو

جو ہو سکے تو بدل دو نوشتۂ تقدیر
نہ ہو سکے تو ستاروں کا احترام کرو

خزاں کی گود میں بھی پھول مُسکرا اُٹھیں
کچھ اس طرح سے بہاروں کا احترام کرو

نشاط و کیف کی دُنیا میں جھومنے والو
کبھی تو اُجڑے دیاروں کا احترام کرو

یہی ہے ذوقِ عبادت کی انتہا ساغر
غمِ حیات کے ماروں کا احترام کرو



تہذیبِ بے نقاب کی آنکھیں نکال دو
اس قوم کے شباب کی آنکھیں نکال دو

جس کی صدا نے وقت کو بیدار کر دیا
اس صاحبِ کتاب کی آنکھیں نکال دو

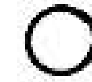
اب منزلِ وفا کی ضرورت نہیں رہی
ہر عزم کامیاب کی آنکھیں نکال دو

جس نے سماعتوں کو دیا درسِ بے خودی
اس نغمۂ رباب کی آنکھیں نکال دو

جس میں نہ ہو بصیرتِ انساں کی چاندنی
اس شیشۂ شراب کی آنکھیں نکال دو

مخمور گیسوؤں کی گھٹاؤں کا وزن ہے
پُر نورِ مہتاب کی آنکھیں نکال دو

ساغر نکھر سکے نہ جہاں نکہتِ خودی
اس قریۂ گلاب کی آنکھیں نکال دو



وہ بلائیں تو کیا تماشا ہو
ہم نہ جائیں تو کیا تماشا ہو

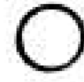
یہ کناروں سے کھیلنے والے
ڈوب جائیں تو کیا تماشا ہو

بندہ پرور! جو ہم پہ گزری ہے
ہم بتائیں تو کیا تماشا ہو

آج ہم بھی تیری وفاؤں پر
مسکرائیں تو کیا تماشا ہو

تیری صورت جو اتفاق سے ہم
بھول جائیں تو کیا تماشا ہو

وقت کی چند ساعتیں ساغر
لوٹ آئیں تو کیا تماشا ہو



جذبۂ سوزِ طلب کو بیکراں کرتے چلو
ذرّے ذرّے کو چراغِ کارواں کرتے چلو

چشمِ ساقی پر تبسّم میکدہ بہکا ہوا
آؤ قسمت کو حریفِ کہکشاں کرتے چلو

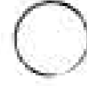
جن سے زندہ ہو یقین و آگہی کی آبرو
عشق کی راہوں میں کچھ ایسے گماں کرتے چلو

زندگی کو لوگ کہتے ہیں برائے بندگی
زندگی کٹ جائے گی ذکرِ بتاں کرتے چلو

ہر نفس اے جینے والو! شغلِ پیمانہ رہے
بے خودی کو زندگی کا پاسباں کرتے چلو

طُور پر موقوف کیوں ہو ہر تجلّی کی جھلک
ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے جلوہ فشاں کرتے چلو

چھیڑ کر ساغر کسی کے گیسوؤں کی داستاں
لالہ و گُل کو ذرا شعلہ زباں کرتے چلو



چمن چمن، کلی کلی، روش روش پکار دو
وطن کو سرفروش دو، وطن کو جاں نثار دو

جو اپنے غیظِ بیکراں سے کوہسار پیس دیں
جو آسماں کو چیر دیں ہمیں وہ شہسوار دو

یہی ہے عظمتوں کا اک اصولِ جاوداں حضور
امیر کو شجاعتیں، غریب کو وقار دو

نظر نظر میں موجزن تجلیوں کے قافلے
وہ جذبۂ حیاتِ نو بشر بشر اُبھار دو

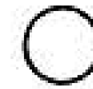
شعور کے لباس میں صداقتیں ہیں منتظر
خلوص و اعتبار کے جہان کو نکھار دو

تصوّرات زندگی کو پھر لہو کا رنگ دیں
چلو! جنوں کی وسعتوں پہ دانشوں کو وار دو

فضائیں جس کی نکہتوں سے ہوں وقارِ گُلستاں
تو ایسے ایسے پھُول کو ستارہ بہار دو

جو قلب و دل کے ساتھ ساتھ میکدے کو پھُونک دیں
مجھے خُدا کے واسطے وہ جام پُر شرار دو

چھلک رہا ہے خلوتوں میں ساغرِ مشاہدات
اُٹھو سخنورو! زمیں پہ کہکشاں اتار دو



جبرِ ہستی میں خودی کا نام لو
ظلمتوں میں روشنی کا نام لو

پتھروں کو چاند کے ٹکڑے کہو
مر رہے ہیں زندگی کا نام لو

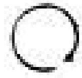
ہر شگوفہ ہے چمن میں ناتواں
احتیاطاً تازگی کا نام لو

وحشت و دیوانگی کے باب میں
بے تکلف آدمی کا نام لو

مَیں ہوں مُرجھائی بہاروں کا نقیب
تم فضائے شبنمی کا نام لو

راہ و منزل کے تقاضے ہیں نئے
رہبری یا رہزنی کا نام لو

کچھ تو ہو ساغر وقارِ شامِ غم
مسکرا کر بے کسی کا نام لو



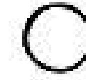
چاندنی شب ہے ستاروں کی ردائیں سی لو
عید آئی ہے بہاروں کی ردائیں سی لو

چشمِ ساقی سے کہو تشنہ اُمیدوں کے لئے
تم بھی کچھ بادہ گُساروں کی ردائیں سی لو

ہر برس سوزنِ تقدیر چلا کرتی ہے
اب تو کچھ سینہ فگاروں کی ردائیں سی لو

لوگ کہتے ہیں تقدس کے سُبو ٹوٹیں گے
جھومتی رہگذاروں کی ردائیں سی لو

قُلزمِ خُلد سے ساغر کی صدا آتی ہے
اپنے بیتاب کناروں کی ردائیں سی لو!



زُلفوں کی گھٹائیں پی جاؤ
وُہ جو بھی پلائیں پی جاؤ

اے تشنہ دلانِ جورِ خزاں
پھولوں کی ادائیں پی جاؤ!

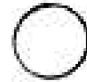
تاریکیِ دوراں کے مارو!
صبحوں کی ضیائیں پی جاؤ!

نغمات کا رس بھی نشہ ہے
بربط کی صدائیں پی جاؤ!

مخمور شرابوں کے بدلے
رنگین خطائیں پی جاؤ!

اشکوں کا مچلنا ٹھیک نہیں
بے چین دُعائیں پی جاؤ!

احساس کے ٹوٹے ساغر میں
یاروں کی وفائیں پی جاؤ!



اے دیوارو! کچھ تو بولو!
جھوٹی چپ کے بندھن کھولو

شاید کوئی قُلزم نکلے
صحراؤں کی جیب ٹٹولو

ان کا وعدہ صبح کا تارہ
یہ چنگاری من میں پچھولو

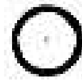
اِس شب کی مجروح سحر تک
جلتے رہنا دِل کے پھپھولو!

رات کا پنچھی کہتا جائے
دِن چڑھ آیا، آنکھیں کھولو

راوی کی لہروں پہ ناچو
اے پنجاب کے ڈھولو

پھول کھلیں برسات میں جیسے
آج ذرا ہنس ہنس کر رولو

ساقی پانی مے بن جائے
ساغر کے اشعار کو گھولو



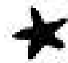
آبِ انگور سے وضو کر لو
دوستو! بیعتِ سبو کر لو

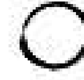
گُر بتا دیں گے بادشاہی کے
ہم فقیروں سے گفتگو کر لو

اُن سے ملنا کوئی محال نہیں
اُن سے ملنے کی آرزو کر لو

دو قدم رائیگاں ہوئے تو کیا
دو قدم اور جستجو کر لو

جشنِ زارِ حیات میں ساغر
چار دن تم بھی ہاؤ ہو کر لو





ارے ناخداؤ! ارے ناخداؤ
مجھے بھی بچاؤ! مجھے بھی بچاؤ

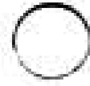
چراغاں سے ہے ظُلمت کدوں کا مداوا
نظر کو نکھارو! دِلوں کو جلاؤ!

ہمیں فرصتِ آہ تک بھی نہیں ہے
اُنہیں یہ تکلّف کہ نغمے سناؤ

بِکی کِس کی عصمت لٹی کِس کی دُنیا
نہیں کیا تم اپنی دکانیں سجاؤ

تصوّر کی پاکیزگی چاہتے ہو!
غمِ یار کی چاندنی میں نہاؤ

سرِمیکدہ لوگ بیٹھے ہیں ساغرؔ
لبوں پر لئے تشنگی کے الاؤ



آشنا ملتا نہیں ناآشنا سے مِل چلو
ہے تقاضائے وفا اک بے وفا سے مِل چلو

اور بھی کچھ راز ہیں دیوارِ گلشن سے پرے
برگِ آوارہ ہو یا بادِ صبا سے مِل چلو

میرا دعویٰ ہے کہ منزل مل ہی جائے گی ضرور
شرط یہ ہے تم کسی کے نقشِ پا سے مِل چلو



جب سے دیکھا پری جمالوں کو
موت سی آگئی خیالوں کو!

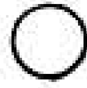
دیکھ تشنہ لبی کی بات نہ کر
آگ لگ جائے گی پیالوں کو!

پھر اُفق سے کسی نے دیکھا ہے
مسکرا کر خراب حالوں کو!

فیض پہنچا ہے بارہا ساقی
تیرے مستوں سے ان شوالوں کو!

دونوں عالم پہ سرفرازی کا
ناز ہے تیرے پائمالوں کو

اس اندھیروں کے عہد میں ساغر
کیا کرے گا کوئی اُجالوں کو



سایۂ زُلفِ بُتاں میں بیٹھو
اس پرستش کے جہاں میں بیٹھو

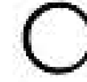
مہ وَشو صُبح یقیں ہونے تک
منزلِ شام گماں میں بیٹھو

ان کے پہلو میں بھی دِل ہوتے ہیں
بزمِ آشفتہ سراں میں بیٹھو

لوگ کہتے ہیں شفاعت کیلئے
دو گھڑی بادہ کشاں میں بیٹھو

حُسنِ افکار کے جھولے ہیں یہاں
آؤ ساغر کے جہاں میں بیٹھو





زندگی کا رنگ دینا ہے تری بیداد کو
سرخیٔ خونِ تمنا چاہیئے فرہاد کو

نامکمل ہیں ابھی مظلوم کی رسوائیاں
پھر ذرا ترتیب دیجئے ظلم کی روداد کو

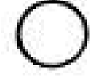
یہ جبیں پلکوں کے جھولے اور اشکِ آرزو
مسکرا کر پالتا ہوں درد کی اولاد کو

دام کے حلقے لگائے تھے وہیں صیاد نے
صید نے معصوم سمجھا تھا جہاں صیاد کو

میرے خونِ آرزو سے زندگی کی آبرو
میں نے رنگیں کر دیا ہے عالمِ ایجاد کو

جستجو پھر بھی ترے غم کی رہی احساس کو
دربدر لیکر پھرا ہوں اس دلِ ناشاد کو

راہرو ساغر کسی سے دل لگاتے ہیں کہاں
منزلوں پر چھوڑ دیں گے راستے کی یاد کو



اللہ رے اُس چشمِ عنایات کا جادو
تا عمر رہا حسنِ ملاقات کا جادو

معلوم نہ تھا سحر گر یدانِ وفا کو
صبحوں کے پسِ پردہ ہے ظلمات کا جادو

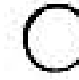
آنکھوں میں رواں کوثر و تسنیم کے منتر
زلفوں میں نہاں شامِ خرابات کا جادو

آتا ہو جسے رسمِ محبت کا وظیفہ
چلتا نہیں اس پر غمِ حالات کا جادو

بربط کا جگر چیر گئی تار کی فریاد
مطرب پہ اثر کر گیا نغمات کا جادو

لہرائے وہ گیسُو کہ اُٹھیں غم کی گھٹائیں
اشکوں کی جھڑی بن گئی برسات کا جادُو

ہم ساحرِ اقلیمِ سُخن بن گئے ساغر
اس ڈھب سے جگایا ہے خیالات کا جادُو



محبت منتقلِ غم ہے، محبت غم کا گہوارہ
جو آنسو رنگ لے آئے وہی دامن کا شہ پارہ

جسے ارماں کا خوں دے کر بنامِ آرزو سینچا
خدا جانے کہاں ہے وہ جہانِ زندگی آرہ

مرا ذوقِ خریداری ہے اِک جنسِ گراں مایہ
کبھی پھولوں کی شیدائی کبھی کانٹوں کا بنجارہ

جہاں منصب عطا ہوتے ہیں بے فکر و فراست بھی
وہاں ہر جستجو جھوٹی وہاں ہر عزم ناکارہ

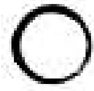
بسا اُوقات چھُو لیتی ہے دامن کبریائی کا
تمہاری جنبشِ ابرُو، مری تخلیقِ آوارہ

نہ جانے محتسب کیوں میکدے کا نام دیتے ہیں
جہاں کچھ آدمی کرتے ہیں اپنے درد کا چارہ

ترے گیسو خیالوں کی گرفتِ ناز سے گزرے
کہ جیسے ایک جوگی بن میں لہراتا ہے دوتارہ

پلٹ آئے ہیں شاید انقلاب دیکھے لمحے
نظر کی وسعتوں میں ڈوبتا جاتا ہے نظارہ

فقط اک ہات میں ٹوٹا ہوا ساغر اُٹھانے سے
لرزہ اُٹھا ہے اے یزداں تری عظمت کا مینارہ



کچھ کیفِ سحر ہے نہ مجھے شام کا نشّہ
ہے میرے لئے بادۂ بے نام کا نشّہ

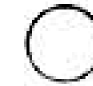
آنکھوں سے چھلکتے ہوئے عرفاں کے ترانے
زلفوں سے برستا ہوا الہام کا نشّہ

ہر کام لرزتے ہوئے تدبیر کے پیکر
تقدیر کی آنکھوں میں ہے آلام کا نشّہ

ہر دل میں تڑپتے ہوئے ارماں کی کہانی
ہر آنکھ میں خونِ دلِ ناکام کا نشّہ

پھر ڈوب گیا گیسوئے جاناں کی مہک میں
دو دن تو رہا گردشِ ایام کا نشّہ

ہیں شیشہ و ساغر کے یہاں رنگ انوکھے
ہے ایک یہاں بادہ گلفام کا نشّہ



فضا مغموم ہے ساقی! اٹھا چھلکا کوئی پیمانہ
اندھیرا بڑھ چلا ہے لا ذرا قندیلِ میخانہ

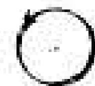
بہ فیضِ زندگی گزرے ہیں ایسے مرحلوں سے ہم
کہ اپنے راستے میں اب نہ بستی ہے نہ ویرانہ

بس اتنی بات پر دشمن بنی ہے گردشِ دوراں
خطا یہ ہے کہ چھیڑا کیوں تری زلفوں کا افسانہ

چراغِ زندگی کو ایک جھونکے کی ضرورت ہے
تمہیں میری قسم ہے پھر ذرا دامن کو لہرانا

دلوں کو شوق سے روندو، خرامِ ناز فرماؤ
اگر محشر ہوا تو پھر مجھے مجرم نہ ٹھہرانا

تری محفل میں ساغر سا بھی کوئی اجنبی ہوگا
یہ ظالم ایک مدت سے نہ اپنا ہے نہ بیگانہ



ہے فغانِ لالہ و گل مست نظاروں کے ساتھ
بجھ رہی ہے تشنگی پھولوں کی انگاروں کے ساتھ

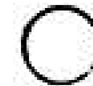
آئے گا شاید عزیزِ مصر بکنے کے لئے
آج خود یوسف کو دیکھا ہے خریداروں کے ساتھ

ہر قدم پر زندگی کی آبرو خطرے میں ہے
ظلمتوں کے قافلے دیکھے ہیں مہ پاروں کے ساتھ

مفلسوں پر ہنس رہی ہیں عظمتیں ابلیس کی
اور خدا کی رحمتیں منسوب زرداروں کے ساتھ

سر برہنہ عابدہ کمخواب و ریشم کے بغیر
ناچتی ہے عاصمہ سکوں کی جھنکاروں کے ساتھ

نغمۂ بلبل نہیں تو نالۂ دل ہی سہی
ملتے جلتے ہیں بیاباں بھی چمن زاروں کے ساتھ



وقت کے رنگیں گلدستے کو یاد آئے گا ٹھنڈا ہاتھ
جب بکھریں گے وہ گیسو تو مرجائے گا ٹھنڈا ہاتھ

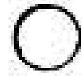
بھیگی پلکیں سوچ کی الجھن دامن تھامے پوچھ رہی ہے
کب تک تار گریباں یارو سلجھائے گا ٹھنڈا ہاتھ

ساز تغزل چھیڑنے والو اے افسانے لکھنے والو
آج لکیروں کی تفسیریں دہرائے گا ٹھنڈا ہاتھ

گرم لہو کی بوندیں بوتیں تنہائی کی مٹی ڈالیں
پت جھڑ آئے ان شاخوں پر اُگ آئے گا ٹھنڈا ہاتھ

پتھر پتھر جوت جلے گی ساحل ساحل شعلے ہوں گے
بھیگی بھیگی سرد ہوائیں شرمائے گا ٹھنڈا ہاتھ

باغ کے مالی میرے غنچے غیروں نے پامال کئے ہیں
پھر بھی تیری پھلواری کو مہکائے گا ٹھنڈا ہاتھ



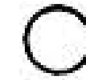
بند گر ہو نہ تیرا خمیازہ
بھوک ہے زندگی کا دروازہ

چارہ گر بانکپن مبارک ہو!
زخمِ دل ہو گئے ترو تازہ

پوچھ لو! تجربوں کے گیتوں سے
دے رہی ہے حیات آوازہ

ساحلِ آرزو سے کرتے ہیں
حسرتوں کے بھنور کا اندازہ

چند غزلوں کے روپ میں ساغر
پیش ہے زندگی کا شیرازہ

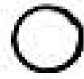


مضمحل دردِ غم سے بے چارہ
پھر مجھے زندگی نے للکارہ!

سلطنت ہے قناعتِ درویش
ہر نفس ہے سکندر و دارا!

داغ ہیں گُل چمن کے سینے پر
اشک افشاں ہے چشمِ نظارہ

چاندنی لُٹ رہی ہے یادوں کی
زخم دل ہو گئے ہیں مہ پارہ



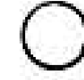
پُوچھا کسی نے حال کسی کا تو رو دیئے
پانی میں عکس چاند کا دیکھا تو رو دیئے

نغمہ کسی نے ساز پہ چھیڑا تو ہنس پڑے
غنچہ کسی نے شاخ سے توڑا تو رو دیئے

اُڑتا ہوا غبار سرِ راہ دیکھ کر
انجام ہم نے عشق کا سوچا تو رو دیئے

بادل فضا میں آپ کی تصویر بن گئے
شاید کوئی خیال سے گزرا تو رو دیئے

رنگِ شفق سے آگ شگوفوں میں لگ گئی
ساغر ہمارے ہاتھ سے چھلکا تو رو دیئے



کچھ حرفِ التجا تھے دعاؤں سے ڈر گئے
ارمان بندگی کے خداؤں سے ڈر گئے

اب کون دیکھتا ہے ترے شمس کی طرف
سُورج مُکھی کے پھول شعاؤں سے ڈر گئے

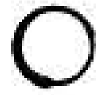
ہنس کر جو جھیلتے تھے زمانے کی تلخیاں
اے چشمِ یار! تیری اداؤں سے ڈر گئے

رنگیں فضا میں جل گئیں خاموش تتلیاں
آنچل اُڑے تو پھول ہواؤں سے ڈر گئے

آہوں کو اعتبارِ سماعت سمجھ لیا
نغموں کی بے قرار صداؤں سے ڈر گئے

ساقی نے مسکرا کے گلے سے لگا لیے
وہ آدمی جو اپنی خطاؤں سے ڈر گئے

تشنہ لبی نے ساغر و مینا کو ڈس لیا
زلفوں کی مست مست گھٹاؤں سے ڈر گئے



شامِ خزاں کی گُم سُم بولی
جیون لمحے زہر کی گولی

میرے آنسو اور ستارے
کھیل رہے ہیں آنکھ مچولی

دو پھولوں کی خاطر تڑپیں
آج بہاروں کے ہمجولی

چاند کا سایہ چھت سے اُترا
ہمسائے نے کھڑکی کھولی

توڑ دیا دَم دیوانوں نے
عمر جنوں کی پوری ہولی

پھول بھی ہے وہ کانٹا بھی ہے
سَن میلا ہے، صورت بھولی

لمبی ہے تقدیر کی ڈوری
کس نے ناپی کس نے تولی

اپنی دنیا رین بسیرا
اپنی دولت خالی جھولی

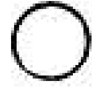
جسم کا زنداں رَوزن رَوزن
جب جی چاہا سُوئی چبھولی

میرے شعروں کا مجموعہ
مست غزالوں کی اِک ٹولی

خاکِ درِ میخانہ ہم نے
ساقی پیمانوں میں گھولی

پتّے بھی اشجار کے نغمے
سائے ہیں دیوار کی بولی

چھینٹ غمِ عصیاں کی ساغر
ہم نے شرابِ ناب سے دھولی



کچھ علاجِ وحشتِ اہلِ نظر بھی چاہیئے
ایک پتھر بر دکانِ شیشہ گر بھی چاہیئے

نامکمل ہے سقوطِ کارواں کی داستاں
اس میں تھوڑا سا بیانِ راہبر بھی چاہیئے

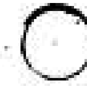
جن کے دامن میں دعاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں
ان غریبوں کی دعاؤں میں اثر بھی چاہیئے

گلستانِ آرزو کے انقلابی دَور میں
ایک جشنِ موسمِ برق و شرر بھی چاہیئے

جو لگا دیتے ہیں قصرِ زندگی میں آگ سی
ایسے شعلوں کے لیئے اک اشکِ تر بھی چاہیئے

پھر انہی انگڑائیوں میں حشر کے ساماں ہوں
بزمِ جاناں میں کوئی آشفتہ سر بھی چاہیئے

ہوں نہ ساغرؔ جس میں سنگ و میل کی پابندیاں
منزلوں تک ایک ایسی رہگذر بھی چاہیئے



غنچے فضائے نَو میں گرفتار ہو گئے
کچھ پھُول اپنے رنگ سے بیزار ہو گئے

کتنے تصورات ہواؤں میں اُڑ گئے
کتنے خیال سایۂ دیوار ہو گئے

شبلی کا پھُول جذبۂ منصُور کی صدا
راہِ وفا میں تیغ کی جھنکار ہو گئے

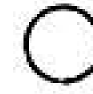
ڈھلتی رہیں شعور میں تاروں کی تابشیں
اِک جام پی کے صاحبِ اسرار ہو گئے

ہم بیکسوں کا چاند کی کرنوں سے واسطہ
زُلفوں کو چھُو لیا تو خطا وار ہو گئے

دل کی چبھن نے کیفِ تمنّا بڑھا دیا
کانٹے بھی آج صورتِ گلزار ہو گئے

پروانے بن گئے ہیں چنبیلی کی نکہتیں
کیا! دیکھنا کہ صبح کے آثار ہو گئے

ساغرؔ کا بجلیوں نے سماں اور کر دیا
ہم ظلمتوں سے کھیل کے انوار ہو گئے



ہر شگوفہ سناں کی صورت ہے
موسمِ گُل خزاں کی صورت ہے

لمحہ لمحہ ہے بوجھ سینے کا
وقت سنگِ گراں کی صورت ہے

ہے ورائے قرار آنسو بھی
درد اِک مہرباں کی صورت ہے

راستے راہنمائے دیدہ و دل
زندگی کارواں کی صورت ہے

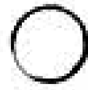
ذوقِ تدبیر ہو تو ہر ذرّہ
جلوۂ کہکشاں کی صورت ہے

زندگانی ہے گوش بر آواز
آدمی داستاں کی صورت ہے

ہائے دستورِ محفلِ ہستی
خامشی بھی زباں کی صورت ہے

میرے اشعار سُن کے فرمایا
ایک یہ بھی فغاں کی صورت ہے

اپنا ویرانۂ الم ساغرؔ!
اِن دنوں گلستاں کی صورت ہے



روشن ہمیں سے منزلِ ہستی کے مرحلے
ہم کارواں کے ساتھ بہت دُور تک چلے

اِس شامِ غم کے بعد ہے اک ایسا راستہ
جس میں چراغ جلتے ہیں ظلمات کے تلے

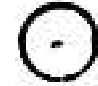
اِک عہدِ نو بھی اپنا مداوا نہ کر سکا
لطف و عطا کی گود میں جور و ستم پلے

چھیڑیں کسی کے گیسوئے برہم کی داستاں
رنج و الم کی رات کسی طرح تو ٹلے

جلتی رہیں دیارِ محبت کی مشعلیں
کیا جانے آفتابِ تمنّا کہاں ڈھلے

پھرتے ہیں لوگ چاک گریباں گلی گلی
مجروح زندگی کو لگائے ہوئے گلے

ساغر سلگ رہی ہے شگوفوں پہ چاندنی
سیرِ چمن کو نکلے ہیں دو چار دل جلے



ہر موج ہے افسردہ تو مغموم ہیں دھارے
ایسے میں کوئی شورِ تلاطم کو پکارے

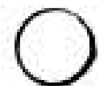
خود نکہتِ گل جرمِ چمن میں تھی ملوّث
جب غور سے دیکھا تو نہ بجلی نہ شرارے

مائل بہ تغیّر ہے یہاں فطرتِ بےتاب
بدنام ہیں ساقی کی نگاہوں کے اشارے

شاخوں پہ یہ بکھرے ہوئے گیسوئے پریشاں
منسوب ہیں ان سے مرے الہام کے پارے

آئینِ مروّت وہی ترتیب کرے گا
جو اپنے لہو سے رُخِ آلام نکھارے

شاید کہ نئی فصل کی تقدیر جگا دیں
یہ ہوش میں ڈوبے ہوئے مدہوش نظارے



جام ٹکراؤ وقت نازک ہے
رنگ چھلکاؤ! وقت نازک ہے

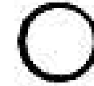
حسرتوں کی حسین قبروں پر
پھول برساؤ! وقت نازک ہے

اک فریب اور زندگی کسے لئے
ہاتھ پھیلاؤ! وقت نازک ہے

رنگ اُڑنے لگا ہے پھولوں کا
اب تو آ جاؤ! وقت نازک ہے

تشنگی تشنگی ارے توبہ
زُلف لہراؤ وقت نازک ہے

بزمِ ساغرؔ ہے گوش بر آواز
کچھ تو فرماؤ وقت نازک ہے



ہر شے ہے پُر ملال بڑی تیز دُھوپ ہے
ہر لب پہ ہے سوال بڑی تیز دُھوپ ہے

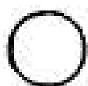
چکرا کے گر نہ جاؤں میں اس تیز دُھوپ میں
مجھ کو ذرا سنبھال بڑی تیز دُھوپ ہے

دے حکم بادلوں کو خیاباں نشین ہوں
جام و سبُو اُچھال بڑی تیز دُھوپ ہے

ممکن ہے ابرِ رحمتِ یزداں برس پڑے
زلفوں کی چھاؤں ڈال بڑی تیز دُھوپ ہے

اب شہرِ آرزو میں وہ رعنائیاں کہاں
ہیں گُل کدے نڈھال بڑی تیز دُھوپ ہے

سمجھی ہے جس کو سایۂ اُمید عقلِ خام
ساغرؔ کا ہے خیال بڑی تیز دُھوپ ہے



مآلِ نغمہ و ماتم فروخت ہوتا ہے
خوشی کے ساتھ یہاں غم فروخت ہوتا ہے

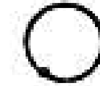
وہ جس کو آج بھی کچھ لوگ حُسن کہتے ہیں
بصد نگارشِ پیہم فروخت ہوتا ہے

بڑے حسین گھنیرے سیاہ پردوں میں
جمالِ عصمتِ مریم فروخت ہوتا ہے

بہارِ وادیٔ گنگ و جمن کے ساتھ یہاں
وقارِ کوثر و زمزم فروخت ہوتا ہے

وہ جسمِ مرمریں نظریں بھی جس کو چھو نہ سکیں
برائے رونقِ عالم فروخت ہوتا ہے

طلسم خانۂ صد رنگ و بُو میں اے ساغر
فریبِ شعلہ و شبنم فروخت ہوتا ہے



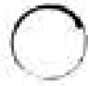
تن سُلگتا ہے من سُلگتا ہے
جب بہاروں میں بن سُلگتا ہے

نوجوانی عجیب نشہ ہے
چھاؤں میں بھی بدن سُلگتا ہے

جانے کیوں چاندنی میں پچھلی رات
چپکے چپکے چمن سُلگتا ہے

جب وہ محوِ خرام ہوتے ہیں
رنگِ سرو سمن سُلگتا ہے

تیرے سوزِ سخن سے اے ساغر
زندگی کا چلن سُلگتا ہے



چمن پہ دام پہ درویش مسکراتا ہے
ہر اک مقام پہ درویش مسکراتا ہے

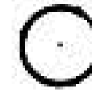
صراحی بزم میں جب قہقہے اگلتی ہے
سکوتِ جام پہ درویش مسکراتا ہے

ہزار حشر اٹھا اے تغیرِ دوراں
ترے خرام پہ درویش مسکراتا ہے

شفق میں خونِ شہیداں کا رنگ شامل ہے
فروغِ شام پہ درویش مسکراتا ہے

کبھی خدا سے شکایت کبھی گلہ خود سے
مذاقِ عام پہ درویش مسکراتا ہے

ہوس مشیر ہو جس بادشاہ کی ساغر
تو اُس غلام پہ درویش مسکراتا ہے



یہ جو شام و سحر کا میلہ ہے
سب تمہاری نظر کا میلہ ہے

بہتے دریا کی موج سے پوچھو
عاشقیٔ چشمِ تر کا میلہ ہے

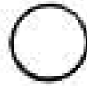
میرے برباد آشیاں کو نہ دیکھ
یہ بہاروں کے گھر کا میلہ ہے

پھر ملیں گے اگر بہار آئی
زندگی رہگزر کا میلہ ہے

چاندنی میں قرارِ دل نہ لُٹا
چاندنی رات بھر کا میلہ ہے

جل بجھی شاخِ آشیاں اے دوست
پھر بھی برق و شرر کا میلہ ہے

کشتیٔ ماہ میں چلو ساغر
آج راوی نگر کا میلہ ہے



ترے غم کو متاعِ حسنِ انساں کر لیا میں نے
نگارِ آدمیت کو غزل خواں کر لیا میں نے

تڑپ کر سوزِ دل کو جلوہ ساماں کر لیا میں نے
بہت بے نور تھی دنیا چراغاں کر لیا میں نے

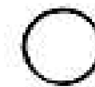
کِسی کے اِک تبسّم پہ اساسِ زندگی رکھ لی
شراروں کو نشیمن کا نگہباں کر لیا مَیں نے

اُٹھا کر چُوم لی ہیں چند مُرجھائی ہوئی کلیاں
نہ تم آئے تو یوں جشنِ بہاراں کر لیا مَیں نے

خُدا رکھے یہ عُذرِ جَور باقی تم نہ شرماؤ!
اب اپنی آرزوؤں کو پشیماں کر لیا مَیں نے

ابھی تک بے کفن سی ہے مری وحشت کی عُریانی
یہ کِس اُمید پہ گھر کو بیاباں کر لیا مَیں نے

کبھی ساغرؔ اگر میں وجد میں آیا جو لہرا کر
تو اپنے ساتھ دُنیا کو بھی رقصاں کر لیا مَیں نے



شہیدوں کے مزاروں تک چلیں گے
ذرا پی لیں ستاروں تک چلیں گے

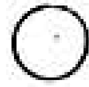
سُنا ہے یہ بھی رسمِ عاشقی ہے
ہم اپنے غمگساروں تک چلیں گے

چلو تُم بھی سفر اچھا رہے گا
ذرا اُجڑے دیاروں تک چلیں گے

جنُوں کی وادیوں سے پھُول چُن لو
وفا کی یادگاروں تک چلیں گے

حسیں زُلفوں کے پرچم کھول دیجئے
مہکتے لالہ زاروں تک چلیں گے

چلو ساغرؔ کے نغمے ساتھ لے کر
چھلکتی جوئے باروں تک چلیں گے

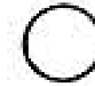


تہذیبِ جنوں کار پہ تنقید کا حق ہے
گرتی ہوئی دیوار پہ تنقید کا حق ہے

ہاں! میں نے لہو اپنا گلستاں کو دیا ہے
مجھ کو گُل و گلزار پہ تنقید کا حق ہے

میں یاد دلاتا ہوں شکایت نہیں کرتا
بھُولے ہوئے اقرار پہ تنقید کا حق ہے

مجرُوح جو کردے دلِ انساں کی حقیقت
اُس شوخیٔ گفتار پہ تنقید کا حق ہے!



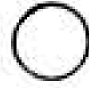
موج در موج کناروں کو سزا ملتی ہے
کوئی ڈُوبے تو سہاروں کو سزا ملتی ہے

میکدے سے جو نکلتا ہے کوئی بے نشہ
چشمِ ساقی کے اشاروں کو سزا ملتی ہے

آپ کی زُلفِ پریشاں کا تصور توبہ
نکہت و نُور کے دھاروں کو سزا ملتی ہے

جب وہ دانتوں میں دباتے ہیں گلابی آنچل
کتنے پُرکیف نظاروں کو سزا ملتی ہے

میرے پیمانے میں ڈھل جاتا ہے پھُولوں کا شباب
میرے ساغر میں بہاروں کو سزا ملتی ہے



سب ہے تیرا کرم غنیمت ہے
جو گزر جائے دم غنیمت ہے

آپ صبحِ بہار لے جائیں
مجھ کو شامِ الم غنیمت ہے

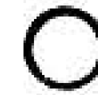
خواہشوں کی پرستش توبہ
آدمی کا بھرم غنیمت ہے

اتنی دشوار تو نہیں منزل
زلفِ جاناں کا خم غنیمت ہے

اِس تقدس کے قحط میں یارو
اُن کا نقشِ قدم غنیمت ہے

تلخیاں کائنات ہیں دل کی
اِس پیالے میں سَتم غنیمت ہے

شبنمی شبنمی فضاؤں میں!
دولتِ چشمِ نم غنیمت ہے



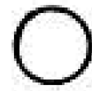
نگارِ معیشت لہو رو رہی ہے
تصوّر کی عظمت لہو رو رہی ہے

شگوفوں کی عزت پہ چھاپے پڑے ہیں
چمن کی لطافت لہو رو رہی ہے

پلا ساقیا! کوئی جامِ غزالی
بھٹکتی بصیرت لہو رو رہی ہے

فقیروں کے اخلاص کی بے زبانی
بروئے جہالت لہو رو رہی ہے

نہ سجدے نہ سجدوں کی تعبیر ساغر
جبینِ شہادت لہو رو رہی ہے



نظر نظر بیقرار سی ہے نفس نفس پُر اسرار سا ہے
میں جانتا ہوں کہ تم نہ آؤ گے پھر بھی کچھ انتظار سا ہے

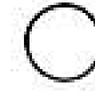
میرے عزیزو! میرے رفیقو—کوئی نئی داستان چھیڑو
غمِ زمانہ کی بات چھوڑو یہ غم تو اب سازگار سا ہے

وہی فسردہ سا رنگِ محفل وہی ترا اِک عام جلوہ
میری نگاہوں پہ بار سا تھا میری نگاہوں میں بار سا ہے

کبھی تو آؤ—کبھی تو بیٹھو—کبھی تو دیکھو—کبھی تو پوچھو
تمہاری بستی میں ہم فقیروں کا حال کیوں سوگوار سا ہے

چلو کہ جشنِ بہار دیکھیں چلو کہ ظرفِ بہار جانچیں
چمن چمن روشنی ہوئی ہے کلی کلی پہ نکھار سا ہے

یہ زُلف بر دوش کون آیا یہ کس کی آہٹ سے گُل کھِلے ہیں
مہک رہی ہے فضائے ہستی تمام عالم بہار سا ہے



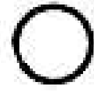
صحنِ کعبہ بھی یہیں ہے تو صنم خانے بھی
دِل کی دُنیا میں گُلستاں بھی ہیں ویرانے بھی

لوگ کہتے ہیں اجارہ ہے ترے جلووں پر
اتنے ارزاں تو نہیں ہیں ترے دیوانے بھی

آتشِ عشق میں پتھر بھی پگھل جاتے ہیں
مجرمِ سوزِ وفا شمع بھی پروانے بھی

کچھ فسانوں میں حقیقت کی جھلک ہوتی ہے
کچھ حقیقت سے بنا لیتے ہیں افسانے بھی

میرے اشعار ہیں تصویرِ تمنّا ساغر
اِن کی آغوش میں ہیں درد کے افسانے بھی



اے چمن والو متاعِ رنگ و بُو جلنے لگی
ہر روش پر نکہتوں کی آبرُو جلنے لگی

پھر لغاتِ زندگی کو دو کوئی حرفِ جنُوں
اے خِرد مندو ادائے گفتگو جلنے لگی

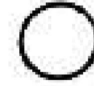
قصرِ آدابِ محبّت میں چراغاں ہو گیا
ایک شمعِ نو ورائے ماو تو جلنے لگی

ہر طرف لُٹنے لگی ہیں جگمگاتی عصمتیں
عظمتِ انسانیت پھر چار سُو جلنے لگی

دے کوئی چھینٹا شرابِ ارغواں کا ساقیا
پھر گھٹا اُٹھی تمنّائے سبُو جلنے لگی

اِک ستارہ ٹوٹ کر معبودِ ظلمت بن گیا
اِک تجلّی آئینے کے رُوبرو جلنے لگی!

دیکھنا ساغر خرامِ یار کی نیرنگیاں
آج پھُولوں میں بھی پروانوں کی خُو جلنے لگی



کس کو بھاتی رہی رات بھر چاندنی
جی جلاتی رہی رات بھر چاندنی

ٹمٹماتے رہے حسرتوں کے دیئے
مُسکراتی رہی رات بھر چاندنی

اک حسیں جسم کی طرح آغوش میں
کسمساتی رہی رات بھر چاندنی

اشک پیتے رہے ہم، کسی اور کو
مے پلاتی رہی رات بھر چاندنی

ایک شبنم کے قطرے کی تقدیر کو!
آزماتی رہی رات بھر چاندنی

صبح دیکھا شگوفے تھے ٹوٹے ہوئے
گُل کھلاتی رہی رات بھر چاندنی

اُن کی زلفوں کے سائے بھٹکتے رہے
لڑکھڑاتی رہی رات بھر چاندنی

رقص کرتے رہے داغہائے جگر
گنگناتی رہی رات بھر چاندنی

غم کے ساغر چھلکتے چھلکتے رہے!
جگمگاتی رہی رات بھر چاندنی

شانِ درویش

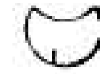
شریعتِ غمِ ہستی سنوارنے والے
تجلّیوں کو فلک سے اُتارنے والے

خدا گواہ! کہ کانٹوں پہ رقص کرتے تھے
چمن چمن کا مقدّر نکھارنے والے

اُفق سے پار بھی جس کا نشاں نہیں ملتا
بہت قریب سے اُس کو پکارنے والے

دلوں کو بخش گئے ہیں قرار کی دولت
تمام عمر تڑپ کر گزارنے والے

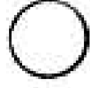
کبھی تختے دار کے قابل کبھی سرِ مقتل
سروں کو نامِ محمدؐ پہ وارنے والے



احساس گراں بار ہے دل ڈوب رہا ہے
پژمردہ چمن زار ہے دل ڈوب رہا ہے

زنجیر کے حلقے تو سلامت ہیں مری جاں
سہمی ہوئی جھنکار ہے دل ڈوب رہا ہے

خاموش ہوئی گرمیٔ بازارِ محبت
اب کون خریدار ہے دل ڈوب رہا ہے



ہم بیخود و سرشار سدا زندہ رہیں گے
حالات کے میخوار سدا زندہ رہیں گے

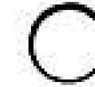
کچھ واقفِ آدابِ محبت نہیں مرتے
کچھ صاحبِ اسرار سدا زندہ رہیں گے

احساس کے پھولوں کو خزاں چھو نہیں سکتی
اُلفت کے چمن زار سدا زندہ رہیں گے

ہے اپنا جنوں عظمتِ دوراں کی کہانی
عظمت کے طلبگار سدا زندہ رہیں گے

نسبت ہے جہاں میں غمِ انسان سے جن کو
وہ دیدۂ بیدار سدا زندہ رہیں گے

ہے قصرِ حقیقت میں ترے دم سے اُجالا
ساغر ترے افکار سدا زندہ رہیں گے



پھول کی پنکھڑی سہرا ہے!
بوند اِک خون کی سہرا ہے

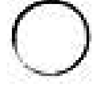
منزلِ آرزو کہاں آئی
آنکھ اُن سے لڑی سہرا ہے

آپ گزرے کہ جوئے مے گزری
مٹ گئی تشنگی سہرا ہے

جانے پتھر کدھر سے آیا تھا
چوٹ دل پر لگی سہرا ہے

اے سمن بار کھڑکیوں والے
جھانک لینا کبھی سہرا ہے

بن گئی آج حسرتیں ساغر!
مجمع بے کسی سہرا ہے

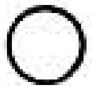


جام و مینا ایاغ ہوتی ہے
ہر کلی باغ باغ ہوتی ہے

آپ کے انتظار کی دُنیا
لامکاں کا سُراغ ہوتی ہے

ایک درویش کی نصیحت بھی
راستے کا چراغ ہوتی ہے

اہلِ وحشت کی زندگی ساغر
کتنی عالی دماغ ہوتی ہے



تدبیر کا کاسہ ہے تقدیر گداگر ہے
ایوانِ سخاوت کی تعمیر گداگر ہے

تو رنگ بھرے اس میں پھر بھی یہ ری مورت
احساسِ مُصوّر میں تصویر گداگر ہے

حالات کے دامن میں افلاس تغیّر ہے
اس دَور میں انساں کی توقیر گداگر ہے

اب شہرِ بصیرت کی اُونچی ہوئیں دیواریں
چڑھتے ہوئے سورج کی تنویر گداگر ہے

ہر داغ تمنّا ہے کشکولِ غمِ ہستی
آہوں سے شکایت ہے تاثیر گداگر ہے

جھنکار کی ہر صورت دریوزۂ نغمہ ہے
ساغر درِ زنداں پہ زنجیر گداگر ہے

○

دِلوں کو اُجالو! سحر ہو گئی ہے
نگاہیں مِلا لو! سحر ہو گئی ہے

اُٹھو کشتیِٔ زیست کو ظلمتوں کے
بھنور سے نکالو! سحر ہو گئی ہے

سنوارو یہ زلفیں کہ شب کٹ چُکی ہے
یہ آنچل سنبھالو! سحر ہو گئی ہے

شکستہ اُمیدوں کی پُروائیوں کو
گلے سے لگا لو! سحر ہو گئی ہے

پگھلنے لگا ہے ضمیرِ مشیّت
اُٹھو سونے والو! سحر ہو گئی ہے

بہاروں کے ساغر سے اے مہ جمالو!
ضیائیں اُچھالو! سحر ہو گئی ہے

○

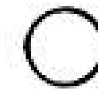
پریشاں عکسِ ہستی، آئینہ بے نُور دیکھا ہے
مری آنکھوں نے افسردہ چراغِ طُور دیکھا ہے

سُرور وکیف کا معیار اپنی ذات ہے ساقی
شرابِ درد سے ہر جام کو معمور دیکھا ہے

بڑی مُدّت سے آشفتہ اُمیدیں یاد کرتی ہیں
کہیں اُس بزم میں یارو دلِ مجبور دیکھا ہے

یہ دستورِ وفا صدیوں سے رائج ہے زمانے میں
صدائے قُرب دی جن کو اُنہی کو دُور دیکھا ہے

کہیں لختِ جگر کھانے سے ساغر بھُوک مٹتی ہے
لہُو کے گھونٹ پی کر بھی کوئی مخمور دیکھا ہے



وہ عزم ہو کہ منزلِ بیدار ہنس پڑے
ہر نقشِ پا پہ جرأتِ رہوار ہنس پڑے

اب کے برس بہار کی صُورت بدل گئی
زخموں میں آگ لگ گئی گلزار ہنس پڑے

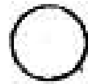
اُس داستانِ درد کی تمہید آپ ہیں
جس داستانِ درد پہ غمخوار ہنس پڑے

حیران ہو رہی ہے شگوفے پہ چاندنی
شاید قفس پہ آج گرفتار ہنس پڑے

مٹ جائے تیرے نام سے ہر تلخیٔ جفا
وُہ کام کر کہ بے کس و نادار ہنس پڑے

میرے جنُوں نے آج وہ سجدہ ادا کیا
بُت خانۂ حیات کے آثار ہنس پڑے

پھر شادماں ہُوئے ہیں خرابے حیات کے
ساغر کسی کے گیسُوئے خم دار ہنس پڑے



دِن کٹ گئے جنُوں کے آلام کے سہارے
سب کام چل گئے ہیں اِک جام کے سہارے

بے چینیوں کی منزل، بیتابیوں کی راہیں
کیا ڈھونڈتا ہے اے دل آرام کے سہارے

حیرت سے دیکھتا ہوں مجروح عشرتوں کو
اِک صُبح ہو رہی ہے اِک شام کے سہارے

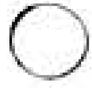
اے سنگ دل زمانے! رُودادِ عاشقی کا
آغاز کر دیا ہے انجام کے سہارے

ترے گیسوؤں کے سائے مری زندگی کا عُنواں
مری شاعری فروزاں ترے نام کے سہارے

مایوسیوں کی مے سے مخمور ہو گئے ہیں
ٹُوٹے ہُوئے سبُو ہیں اب کام کے سہارے

کعبہ بھی پتھّروں کی اِک داستاں ہے یارو!
تقدیرِ بندگی ہیں اصنام کے سہارے

کتنی تجلیّوں سے گھر جل رہے ہیں ساغرؔ
کتنی حقیقتیں ہیں اوہام کے سہارے



راہ پُر شور ہے، منزل فرار ہے
ہم اُلجھتے رہے، گیسوئے یار سے

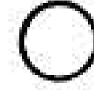
میرا ہر نقشِ پا، خِضر کی داستان
کوئی پوچھے، مرے عزمِ بیدار سے

ہو سکے آپ عنواں کوئی دیجئے!
داستاں بن گئی حرفِ اظہار سے

یُوں بھی ہوتا ہے، شامِ وفا دوستو!
ٹُوٹ جاتا ہے دِل اُن کے اقرار سے

چشمِ ساقی تری عمر ہو جاوداں!
پی گئے زہر بھی تیرے اِصرار سے

دوشِ ساغرؔ نے تکیہ بنایا اُنہیں
جتنے پتھر گرے اُن کی دیوار سے



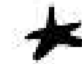
ساقی کی اِک نگاہ کے افسانے بن گئے
کچھ پھول ٹوٹ کر مِرے پیمانے بن گئے

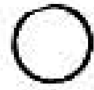
کاٹی جہاں تصوّرِ جاناں میں ایک شب
کہتے ہیں لوگ اس جگہ بُت خانے بن گئے

جِن پر نہ سائے زُلفِ غزالاں کے پڑ سکے
احساس کی نگاہ میں ویرانے بن گئے

جو پی سکے نہ سُرخ لبوں کی تجلّیاں
دُنیا کے تجربات سے انجانے بن گئے

ساغر وہی مقام ہے اِک منزلِ فرزانہ
اپنے بھی جس مقام پہ بیگانے بن گئے





مِرے چمن کو جہاں میں یہ سرفرازی ہے
ہر ایک پھول نئی زندگی کا غازی ہے

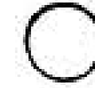
بہار میں بھی سلگتے رہے ہیں کاشانے
کہ یہ بھی ایک طرح کی شعر طرازی ہے

مَیں اُس مقام پہ تُجھ کو تلاش کرتا ہوں
حقیقتوں کا تصرّف جہاں مجازی ہے

خُدا کے نام پہ پہلا سبُو اُٹھاتے ہیں
کہ مے کشوں میں بھی رسمِ پاکبازی ہے

روش روش پہ ہیں برق و شرر کے ہنگامے
مجھے یقیں ہے بہاروں کی کارسازی ہے

لِکھو یہ عظمتِ ہستی کے باب میں ساغر
کہ غزنوی کی جلالت غمِ ایازی ہے



گُل ہُوئی شمعِ شبستاں چاند تارے سو گئے
مَوت کے پہلو میں شامِ غم کے مارے سو گئے

بے قراری میں بھی اکثر دردمندانِ جنُوں!
اے فریبِ آرزو تیرے سہارے سو گئے

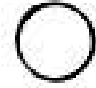
کاروبارِ گرمیِ دوراں کی ٹھنڈی راکھ میں
اے شگوفوں کے خداوندو! شرارے سو گئے

دے رہی ہے آج بھی موجِ حوادث لوریاں
شورشِ طوفاں سے گھبرا کر کنارے سو گئے

جن سے نغمے تھے وفاؤں کے سراپا زندگی
وُہ محبّت کی تلاوت کے اشارے سو گئے

کیا نہیں معلوم تجھ کو اے مرے مغموم دل!
جن سے نظریں تھیں شگفتہ وہ نظارے سو گئے

جن کے دم سے بزم ساغرؔ بھی حریفِ کہکشاں
اے شبِ ہجراں کہاں وُہ ماہ پارے سو گئے

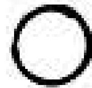


اُمید کے موتی ارزاں ہیں درویش کی جھولی خالی ہے!
پھُولوں سے مہکتے داماں ہیں درویش کی جھولی خالی ہے!

احساس صفاتی پتھر ہے، ایمان سُلگتی دُھونی ہے!
بے رنگ مزاجِ دَوراں میں درویش کی جھولی خالی ہے!

بے نُورِ مروّت کی آنکھیں بے کیف عنایت کے جذبے
ہر سمت بدلتے عنواں ہیں درویش کی جھولی خالی ہے

گُدڑی کے پھٹے ٹکڑے ساغرؔ اجسامِ تخیل کیا ڈھانپیں
فریاد کے نقطے حیراں ہیں درویش کی جھولی خالی ہے



مول اگر بک جائے ہستی
جنسِ محبّت پھر بھی سستی

تُو بھی چُپ ہے مَیں بھی چُپ
دُنیا ہے پتھر کی بستی

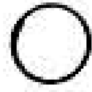
مست خلائیں میرے سجدے
کرتا ہوں آفاق پرستی

درد میں جینا اپنی ہمت
آگ میں جلنا کِس کی ہستی

اپنی بادہ خونِ وفا ہے
اپنی بوتل فاقہ مستی

چہروں کو بدنام نہ کر دے
آئینوں کی چہرہ دستی

کون بلندی سے ٹکرایا
چیخ رہی ہے ساغر پستی



میرے آنسو ہیں کسی شامِ غریباں کے دیئے
جگمگاتے ہی رہیں گے یہ چراغاں کے دیئے

سائے کی طرح منڈیروں سے گزرنے والے
جَل رہے ہیں ابھی ٹوٹے ہوئے ارماں کے دیئے

ظلمتِ دہر میں ہر سمت اُجالا کر دُوں
کاش مل جائیں مجھے کوچۂ جاناں کے دیئے

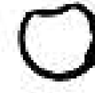
اپنے دامن کی ہواؤں سے بُجھا دو آ کر
دِل کی دُنیا نہ جلا دیں غمِ دوراں کے دیئے

جیسے احساس کی پت جھڑ میں شرارے جاگیں
پھر خیالوں میں جلے جنتِ پیماں کے دیئے

تُند اور تیز کئے ہم نے بگولوں کے مزاج
ہم سے پُر نور ہوئے چشمِ غزالاں کے دیئے

اب تو ایوانِ تصوّر سے دُھواں اُٹھتا ہے
میرے آنگن میں کہاں کیفِ بہاراں کے دیئے

میرے افسانے میں توقیر ہے شب کی ساغر
ماہ و انجم مرے افکار میں عنواں کے دیئے



تیرے جُوڑے کے پھُول مُرجھائے
عِشق کی بندگی کے کام آئے

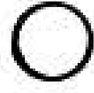
صُبح تیرے جلو میں روشن ہے
میرے ہمراہ شام کے سائے

بے صدا ہے ترانۂ منصور
عقدۂ دار کون سُلجھائے

روشنی تھی تو دُور تھے احباب
اب اندھیروں میں ڈھونڈنے آئے

موت کی گونجتی ہواؤں میں
بارہا نغمے موت کے گائے

اس درندوں کی بھیڑ میں ساغر
کاش انسان کوئی کہلائے

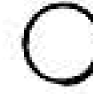


سوزِ تصورات سے تصویر جل گئی
سینوں میں آگ لگ گئی تعبیر جل گئی

ساقی نے اس ادا سے بکھیری ہیں بجلیاں
پیمانۂ حیات کی تنویر جل گئی

لاشے تڑپ رہے ہیں سرِ مقتلِ وفا
بسمل کا رقص دیکھ کے شمشیر جل گئی

تاثیرِ آہِ سرد کی صورت پہ ہنس پڑی
آہوں کو یہ گلہ ہے کہ تاثیر جل گئی



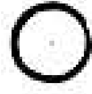
یارب ترے جہان کے کیا حال ہوگئے
کچھ لوگ خواہشات کے دلّال ہوگئے

تپتی رہی ہے آس کی کرنوں پہ زندگی
لمحے جدائیوں کے مہ و سال ہوگئے

بھولی ہے رنگ رنگ کو دنیا کی نرتکی!
نغمے ربابِ وقت کے بے تال ہوگئے

وحشت میں اپنے تارِ گریباں ہی دوستو!
اُلجھے تو ہر قدم پہ گراں جال ہوگئے

ساغرؔ جو کل کھلے تھے وہ غنچے کہاں گئے
ہنگامۂ بہار میں پامال ہوگئے



خوشا کہ باغِ بہاراں ہے زندگی اپنی
کسی کے غم سے فروزاں ہے زندگی اپنی

بہت دنوں سے پریشاں ہیں آپ کے گیسو
بہت دنوں سے پریشاں ہے زندگی اپنی

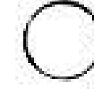
چھلک رہے ہیں کئی حسرتوں کے پیمانے
لہو سے دل کے چراغاں ہے زندگی اپنی

غمِ حیات نے ڈالے ہیں ہاتھ بڑھ کر
کہ بے وطن کا گریباں ہے زندگی اپنی

ترا جہان ہے کیا ایک آئینہ خانہ
کہ جس میں ششدر و حیراں ہے زندگی اپنی

نہ جانے کون سا لمحہ چرا کے لے جائے
متاعِ گردشِ دوراں ہے زندگی اپنی

نہ کوئی پھول نہ ساغر نہ ماہتاب نہ تو
بجھا ہوا سا شبستاں ہے زندگی اپنی



نکلے صدف کی آنکھ سے موتی مرے ہوئے
پھوٹے ہیں چاندنی میں شگوفے جلے ہوئے

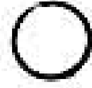
ہے اہتمامِ گریہ و ماتم چمن چمن
رکھے ہیں مقتلوں میں جنازے سجے ہوئے

ہر ایک سنگِ میل ہے اب ننگِ رہگذر
ہیں رہبروں کی عقل پہ پتھر پڑے ہوئے

بے وجہ تو نہیں ہیں چمن کی تباہیاں
کچھ باغباں ہیں برق و شرر سے ملے ہوئے

اب میکدے میں بھی نہیں کچھ اہتمامِ کیف
ویران ہیں شعور تو دل ہیں بجھے ہوئے

ساغر یہ وارداتِ سخن بھی عجیب ہے
نغمہ طرازِ شوق ہوں لب ہیں سلے ہوئے



شمع اُس راہ پر جلی ہے ابھی
رنج کی شب کہاں ڈھلی ہے ابھی

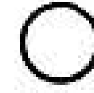
گُل کھلے ہیں تمہاری آہٹ سے
آنکھ مہتاب نے ملی ہے ابھی

دل کہ جس کو فقیر کہتے ہیں
ایک اُجڑی ہوئی گلی ہے ابھی

کاروبارِ جنوں کی گمنامی
شہرتِ عقل سے بھلی ہے ابھی

چاند اُتریں گے رہ گزاروں میں
رسمِ تابندگی چلی ہے ابھی

اب طبیعت بحال ہے ساغر
کچھ ذرا من میں بے کلی ہے ابھی



چوٹ کھا کر خود شناس و خود نگر ہو جائیے
کیوں کسی کے عشق میں شوریدہ سر ہو جائیے

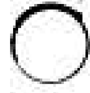
اپنے دل کے داغ بھی لَو دے اُٹھیں تو کم نہیں
اپنی منزل کے لئے خود راہبر ہو جائیے

چھوڑ دیجئے عظمتِ یزداں کی جھوٹی داستاں
آج انساں کی نظر میں معتبر ہو جائیے

آپ بھی دو چار قطرے پی کے میرے جام کے
اہلِ دل اہلِ وفا اہلِ نظر ہو جائیے

صرف طوفاں میں یہی بچنے کی اک تدبیر ہے
جس طرف موجیں اُمڈتی ہوں اُدھر ہو جائیے

پھر ذرا چھلکائیے ساغر مئے دیدار کے
پھر نقابِ رُخ اُلٹ کر جلوہ گر ہو جائیے



دُکھ درد کی سوغات ہے دنیا تری کیا ہے
اشکوں بھری برسات ہے دنیا تری کیا ہے

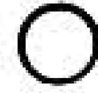
کچھ لوگ یہاں نورِ سحر ڈھونڈ رہے ہیں
تاریک سی اِک رات ہے دنیا تری کیا ہے

تقدیر کے چہرے کی شکن دیکھ رہا ہوں
آئینۂ حالات ہے دنیا تری کیا ہے

پابندِ مشیّت ہے تنفّس بھی نظر بھی
اِک جُزیۂ لمحات ہے دنیا تری کیا ہے

مجروح تقدّس ہے تقدّس کی حقیقت!
رُودادِ خرابات ہے دنیا تری کیا ہے

ساغر بس چھلکتے ہیں سماوات کے اسرار
ساقی کی کرامات ہے دنیا تری کیا ہے



ان بہاروں پہ گلستاں پہ ہنسی آئی ہے
دِل کے ہر داغ فروزاں پہ ہنسی آئی ہے

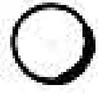
آج پھر جام تہی اور گھٹا اُٹھی ہے
آج پھر رحمتِ یزداں پہ ہنسی آئی ہے

آپ کی زلفِ پریشاں کے تصور میں ہمیں
بارہا گردشِ دوراں پہ ہنسی آئی ہے

میری بھیگی ہوئی پلکوں کی چھما چھم پہ نہ جا
ترے ٹوٹے ہوئے پیماں پہ ہنسی آئی ہے

جب کبھی بچھڑا ہوا دوست ملا ہے کوئی
مجھ کو اخلاصِ عزیزاں پہ ہنسی آئی ہے

مجھ کو اِک زہر کا چھلکا ہوا ساغر دے دو
مجھ کو اس دور کے انساں پہ ہنسی آئی ہے



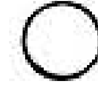
جل رہا ہے چراغِ تنہائی
توسنِ زندگی کہاں آئی

میرے نغموں میں ڈوب جاتی ہے
فیض اور قاسمی کی شہنائی

وُہ فنا کی حدُود سے گزُرا
جس نے ٹھوکر حیات کی کھائی

مَیں شرارہ نہیں ستارہ ہُوں
مَیں نے ذرّوں کی زُلف سُلجھائی

دیکھ کر زرد کونپلیں ساغر
موسمِ گُل کی بات یاد آئی



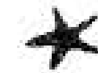
لا اِک خُمِ شراب کہ موسم خراب ہے
کر کوئی انقلاب کہ موسم خراب ہے

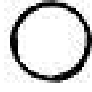
زُلفوں کو بے خودی کی رِدا میں لپیٹ لے
ساقی پہ ہے شباب کہ موسم خراب ہے

غنچوں کو اعتبارِ طلُوعِ چمن نہیں
رُخ سے اُلٹ نقاب کہ موسم خراب ہے

جام و سبُو کے ہوش ٹھکانے نہیں ذرا
مطرب اُٹھا رُباب کہ موسم خراب ہے

اے جاں کوئی تبسّمِ رنگیں کی واردات
پھیکا ہے ماہتاب کہ موسم خراب ہے





راہزن آدمی رہنُما آدمی
بارہا بن چُکا ہے خُدا آدمی

آس کی مُورتیں پُوجتے پُوجتے
ایک تصویر سی بن گیا آدمی

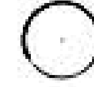
کھُل گئے جنتوں کے وہاں زائچے
دو قدم جھُوم کر جب چلا آدمی

صُبحدم چاند کی رُخصتی کا سماں
جس طرح بحر میں ڈُوبتا آدمی

زندگی خانقاہِ شہُود و بقا
اور لوحِ مزارِ فنا آدمی

کچھ فرشتوں کی تقدیس کے واسطے
سہ گیا آدمی کی جفا آدمی

گو بختی ہی رہے گی فلک در فلک
ہے مشیّت کی ایسی صدا آدمی



خود بخیر! جنوں کو سلام کرنا ہے
جہانِ عشق میں اب اور کام کرنا ہے

یہ رنگ و بُو کے خزانے بڑے درخشاں ہیں
دِل و نگاہ کو بھی لالہ فام کرنا ہے

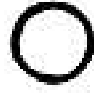
کتابِ صورتِ کونین یوں اُٹھانا ہے
کہ ذرّے ذرّے کو مہرِ دوام کرنا ہے

صدائے بُوذرؓ و سلمانؓ بھی تھی دُنیا میں
مسرّتوں کو غریبوں کے نام کرنا ہے

جنہیں خُدا کی طرح بولنے کی عادت ہے
انہیں زبانِ بشر میں کلام کرنا ہے

مرے شعور کو حاجت نہیں تکلّف کی
تجلّیوں کو نظر کا غلام کرنا ہے

کوئی حقیر سی شے ڈال میرے ساغر میں
کہ زندگی کو برائے عوام کرنا ہے



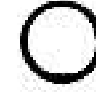
نہ خوفِ خدا ہے نہ خوفِ خدائی
بشر دے رہا ہے بشر کی دہائی!

نہ جانے کہاں کھو گئی ہے مروّت
بڑی دُور تک تو میرے ساتھ آئی!

نگاہوں کے انداز بدلے گئے ہیں
وہی ہے مگر رسمِ جلوہ نمائی

کسی کے مہکتے ہوئے گیسوؤں سے
شگوفوں نے سیکھی ہے شعلہ نوائی

قضائے مقدر بدل دی ہے ساغر
نظر جب کبھی زندگی سے ملائی



بات پھولوں کی سُنا کرتے تھے
ہم بھی شعر کہا کرتے تھے

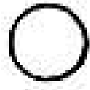
مشعلیں لے کے تمہارے غم کی
ہم اندھیروں میں چلا کرتے تھے

اب کہاں ایسی طبیعت والے
چوٹ کھا کر جو دُعا کرتے تھے

ترکِ احساسِ محبت مُشکل
ہاں مگر اہلِ وفا کرتے تھے

بکھری بکھری ہُوئی زُلفوں والے
قافلے روک لیا کرتے تھے

آج گلشن میں شگوفے ساغر
شکوۂ بادِ صبا کرتے تھے



روداد محبت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے
دو دن کی مسرّت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

جب جام دیا تھا ساقی نے جب دور چلا تھا محفل میں
اک ہوش کی ساعت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

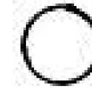
اب وقت کے نازک ہونٹوں پر مجروح ترنم رقصاں ہے
بیدادِ مشیت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

احساس کے میخانے میں کہاں اب فکر و نظر کی قندیلیں
آلام کی شدت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

کچھ حال کے اندھے ساتھی تھے کچھ ماضی کے عیار سجن
احباب کی چاہت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

کانٹوں سے بھرا ہے دامن شبنم سے سلگتی ہیں پلکیں
پھولوں کی سخاوت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

اب اپنی حقیقت بھی ساغرؔ بے ربط کہانی لگتی ہے
دنیا کی حقیقت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے



یاد آ کے رہ گئے ہیں زمانے وفاؤں کے
شعلے جگا کے چل دیئے جھونکے ہواؤں کے

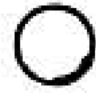
ہر اک قدم پہ تلخیٔ دوراں کی دھوپ تھی
تھے ہم بھی اس گلی میں طلبگار چھاؤں کے

کرتے رہے جو چاند ستاروں کی رہبری
کچھ لوگ منتظر ہیں انہیں رہنماؤں کے

ہر ذہن میں پڑے ہیں تری زلف کے بھنور
ہر دل کی سرزمیں پہ نشاں تیرے پاؤں کے

بے چارگیٔ زیست کا دامن نہ بھر سکا
ہم نے لٹا دیئے ہیں خزانے دعاؤں کے

تجدیدِ ذوقِ ساغر و مینا کی بات کر
بدلے ہوئے ہیں رنگ چمن کی فضاؤں کے

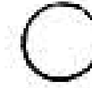


اے دوست یہاں ویرانوں کو گلزار سمجھنا پڑتا ہے
کچھ اونچی نیچی راہوں کو ہموار سمجھنا پڑتا ہے

احساس کے اُلٹے پاؤں سے جب چلتے چلتے تھک جائیں
تو راہگذر کو اے راہی دیوار سمجھنا پڑتا ہے

مجروحِ معیشت کے ہاتھوں انسان کا اب یہ عالم ہے
ہر زخم لگانے والے کو غمخوار سمجھنا پڑتا ہے

جب شاہی قباؤں کی خاطر کچھ جسم برہنہ ہو جائیں
اس وقت غلاموں کو ساغرؔ مختار سمجھنا پڑتا ہے



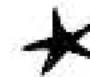
شرابِ ناب کے شیشے کا کاگ کھولا ہے
گرفتِ ساز سے ساقی نے راگ کھولا ہے

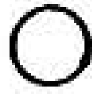
یہ کون بام پہ آیا ہے زُلف لہرا کر
یہ کِس کے بام پہ آکر سہاگ کھولا ہے

یہ فصلِ شوق یہ بے نام آرزُو کا خیال
یہ کِس نے زیست کے سینے پہ ناگ کھولا ہے

جہاں شعور کوئی مشورہ نہیں دیتا
وہاں حیات کے جوگی نے تیاگ کھولا ہے

ہمیں سے حُسنِ گلستاں ہے دِلستاں ساغر
ہمیں نے حُسنِ گلستاں کا بھاگ کھولا ہے





آہن کی سُرخ تال پہ ہم رقص کر گئے
تقدیر تیری چال پہ ہم رقص کر گئے

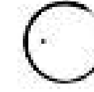
پنچھی بنے تو رفعتِ افلاک پر اُڑے
اہلِ زمیں کے حال پہ ہم رقص کر گئے

کانٹوں سے احتجاج کیا ہے کچھ اس طرح
گُلشن کی ڈال ڈال پہ ہم رقص کر گئے

واعظ فریبِ شوق نے ہم کو بُھلا لیا
فردوس کے خیال پہ ہم رقص کر گئے

ہر اعتبارِ حُسنِ نظر سے گُزر گئے
ہر حلقۂ ہائے چال پہ ہم رقص کر گئے

مانگا بھی کیا تو قطرۂ چشمِ تصرفات
ساغر ترے سوال پہ ہم رقص کر گئے



کیا سماں تھا بہار سے پہلے
غم کہاں تھا بہار سے پہلے

ایک ننھا سا آرزو کا دیا
ضَو فِشاں تھا بہار سے پہلے

اب تماشا ہے چار تنکوں کا
آشیاں تھا بہار سے پہلے

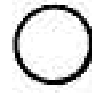
اے مرے دل کے داغ تُو ہی بتا
تُو کہاں تھا بہار سے پہلے

پچھلی شب میں خزاں کا سناٹا
ہمزُباں تھا بہار سے پہلے

چاندنی میں یہ آگ کا دریا
کب رواں تھا بہار سے پہلے

بن گیا ہے سحاب موسمِ گُل
جو دُھواں تھا بہار سے پہلے

لُٹ گئی دل کی زندگی ساغر
دِل جواں تھا بہار سے پہلے



چشمِ ساقی کی عنایات پہ پابندی ہے
اِن دنوں وقت پہ حالات پہ پابندی ہے

بکھری بکھری ہوئی زُلفوں کے فسانے چھیڑو
میکشو! عہدِ خرابات پہ پابندی ہے

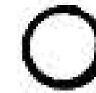
دِل شکن ہو کے چلے آئے تری محفل سے
تری محفل میں تو ہر بات پہ پابندی ہے

درد اٹھا ہے لہو بن کے چھلکنے کیلئے
آج تک کہتے ہیں جذبات پہ پابندی ہے

ہر تمنّا ہے کوئی ڈوبتا لمحہ جیسے
سازِ مغموم ہیں نغمات پہ پابندی ہے

کہکشاں بامِ ثُریا کے تلے سوتی ہے
چاند بے رنگ سا ہے رات پہ پابندی ہے

آگ سینوں میں لگی ساغر و مینا چھلکے!
کوئی کہتا تھا کہ برسات پہ پابندی ہے



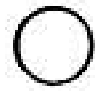
شمع جلی پروانے جاگے
نقش اُبھرے افسانے جاگے

غم جاگا غم خانے جاگے
خوابوں کے ویرانے جاگے

سُن کے مری رودادِ محبت
اپنے اور بیگانے جاگے

بستی بستی شور مچا ہے
شاید پھر دیوانے جاگے

ساغر چھلکے کرنیں پھوٹیں
وُہ دیکھو! مے خانے جاگے



برگشتۂ یزداں سے کچھ بھول ہوئی ہے
بھٹکے ہوئے انسان سے کچھ بھول ہوئی ہے

تارے سے چمک اُٹھے ہیں ساقی کی جبیں پر
شاید میرے ایمان سے کچھ بھول ہوئی ہے

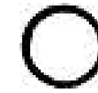
تا حدِ نظر شعلے ہی شعلے ہیں چمن میں
پھولوں کے نگہبان سے کچھ بھول ہوئی ہے

شاخوں پہ چٹکتے ہوئے غنچوں کو مُبارک
اِس زُلفِ پریشان سے کچھ بھول ہوئی ہے

جس عہد میں لُٹ جائے فقیروں کی کمائی
اُس عہد کے سلطان سے کچھ بھُول ہوئی ہے

ہنستے ہیں مری صورت مفتوں پہ شگوُفے
مرے دل نادان سے کچھ بھُول ہوئی ہے

حوروں کی طلب اور مئے وساغر سے ہے نفرت
زاہد ترے عرفان سے کچھ بھوُل ہوئی ہے



اے تغیّر زمانہ یہ عجیب دل لگی ہے
نہ وقارِ دوستی ہے نہ مجال دُشمنی ہے

یہی ظلمتیں چھنیں جو ترے سُرخ آنچلوں میں
انہی ظُلمتوں سے شاید مرے گھر میں روشنی ہے

میرے ساتھ تم بھی چلنا، مرے ساتھ تم بھی آنا
ذرا غم کے راستوں میں بڑی تیز تیرگی ہے

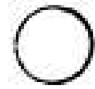
یہ مشاہدہ نہیں ہے مرے درد کی صدا ہے
مرے داغِ دل لُٹے ہیں تری بزم جب سجی ہے

غمِ زندگی! کہاں ہے ابھی وحشتوں سے فرُصت
ترے ناز اُٹھا ہی لیں گے ابھی زندگی پڑی ہے

ترے خشک گیسوؤں میں مری آرزُو ہے پنہاں
ترے شوخ بازُوؤں میں مری داستاں رچی ہے

جسے اپنا یار کہنا اُسے چھوڑنا بھنور میں
یہ حدیثِ دلبراں ہے یہ کمالِ دلبری ہے

وہ گزر گیا ہے ساغرؔ کوئی قافلہ چمن سے
کہیں آگ جل رہی ہے کہیں آگ سو گئی ہے



یہ تری گلیوں میں پھر رہے ہیں جو چاکِ داماں سے لوگ ساقی
کریں گے تاریخ مرتب یہی پریشاں سے لوگ ساقی

اگر یہ اندھیر اور کچھ دن رہا تو ایسا ضرور ہوگا
اُلجھ پڑیں گے بنامِ حالاتِ زُلفِ جاناں سے لوگ ساقی

لگا کوئی ضرب اس ادا سے کہ ٹوٹ جائیں دلوں کی مُہریں
تری قسم تنگ آ گئے ہیں سکوتِ پنہاں سے لوگ ساقی

کوئی نیا رنگ بخش اس کو کوئی نئی رُوح پھُونک اس میں
گریز کرنے لگیں گے ورنہ حدیثِ یزداں سے لوگ ساقی

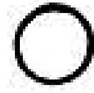
جلو میں صد انقلاب رقصاں لبوں پہ ہلکی سی مُسکراہٹ
نہ جانے آئے ہیں کس جہاں سے یہ حشر ساماں سے لوگ ساقی

چمن کی خیرات چند کانٹے ہی ڈال دے دامنِ طلب میں
وگرنہ مر جائیں گے لپٹ کر درِ گلستاں سے لوگ ساقی

یہ جگنوؤں کی چمک یہ بھی اب سنبھال لیتے ہیں اپنا خرمن
مجھے یقیں ہے کہ ڈر گئے ہیں شبِ چراغاں سے لوگ ساقی

خیال ہے میکدے میں اک بار اور شعلوں کا راج ہوگا
شنید ہے انتقام لیں گے نشاطِ درباں سے لوگ ساقی

مطالبہ کر رہے ہیں سائز کوئی منظّم اَلم عطا کر
کہ باخبر ہو چکے ہیں شاید غمِ فراواں سے لوگ ساقی



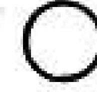
جو حادثے یہ جہاں میرے نام کرتا ہے
بڑے خلوص سے دل نذرِ جام کرتا ہے

ہمیں سے قوسِ و قزح کو ملی ہے رنگینی
ہمارے دَر پہ زمانہ قیام کرتا ہے

ہمارے چاکِ گریباں سے کھیلنے والو
ہمیں بہار کا سوُرج سلام کرتا ہے

یہ میکدہ ہے یہاں کی ہر ایک شے کا حضُور
غمِ حیات بہت احترام کرتا ہے

فقیہہِ شہر نے تہمت لگائی ساغر پر
یہ شخص درد کی دولت کو عام کرتا ہے



یہ دُنیا ہے یہاں ہر لمحۂ تقدیر ظالم ہے
مرے افسانۂ بے نام کی تحریر ظالم ہے

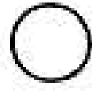
غمِ ہستی کی زنجیروں سے انساں کو کہاں فرصت
کبھی حالات ظالم ہیں کبھی تدبیر ظالم ہے

مصوّر کا قلم رنگینیوں میں ڈوب کر اُبھرا
تصوّر مُسکرا کر کہہ گیا تصویر ظالم ہے

چراغِ آرزو کو اک سہارا دے ہی جاتی ہے
یہاں ڈھلتے ہوئے سُورج کی ہر تنویر ظالم ہے

پلٹ کر زندگی کو زخم تازہ دے گئی اکثر
ہمارے نالہ و شیون کی ہر تاثیر ظالم ہے

چبھو کر دل میں نشتر بیٹھ جاتے ہیں کہیں ساغر
شواہد کہہ رہے ہیں یہ فلک بے پیر ظالم ہے



مرے سوزِ دل کے جلوے، یہ مکاں مکاں اُجالے
مری آہِ پُر اثر نے کئی آفتاب ڈھالے

مجھے گردشِ فلک سے نہیں احتجاج کوئی
کہ متاعِ جان و دل ہے تری زُلف کے حوالے

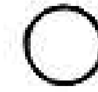
یہ سماں بھی ہم نے دیکھا سرِ خاک رُل رہے ہیں
گُل و انگبیں کے مالک مہ و کہکشاں کے پالے

ابھی رنگ آنسوؤں میں ہے تری عقیدتوں کا
ابھی دل میں بس رہے ہیں تری یاد کے شوالے

مری آنکھ نے سُنی ہے کئی زمزموں کی آہٹ
نہیں بربطوں سے کمتر مئے ناب کے پیالے

یہ تجلیوں کی محفل ہے اسی کے زیرِ سایہ
یہ جہانِ کیف اس کا جسے وہ نظر سنبھالے

یہ حیات کی کہانی ہے فنا کا ایک ساغر
تو لبوں سے مسکرا کر اسی جام کو لگا لے



پھولوں کو آگ لگ گئی نغمات جل گئے
سورج کی تیز دھوپ میں لمحات جل گئے

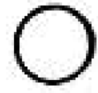
ساقی کی نگہِ کرم ہے تعمیرِ میکدہ
گیسو اُڑے چراغِ خرابات جل گئے

اب دامنِ حیات میں کچھ بھی نہیں رہا
فردا کی سرد آگ میں حالات جل گئے

کلیاں چٹک رہی ہیں کہ شاخوں پہ آبلے
غنچوں کی نکہتوں سے مرے ہاتھ جل گئے

اَب کے برس بہار بصیرت کو ڈس گئی
فکر و نظر کے جھومتے باغات جل گئے

ساغر لُٹے لُٹے ہیں ستارے بجھے بجھے
شاید مرے نصیب کے دِن رات جل گئے



ہم خاک نشیں، خاک بسر شہر میں تیرے
کر لیں گے اسی طرح گزر شہر میں تیرے

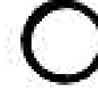
جب تک تیری گلیوں سے رہا ہم کو تعلق
ہم رقص رہے شمس و قمر شہر میں تیرے

کچھ لوگ تمناؤں کا خوں چہرے پہ مل کر
بیٹھے ہیں سرِ راہ گزر شہر میں تیرے

اُٹھتے رہے کلیوں کی جوانی کے جنازے
جلتے رہے پھولوں کے نگر شہر میں تیرے

پلتی ہے تقدس کے لبادے میں حقارت
بجتے ہیں حوادث کے گجر شہر میں تیرے

ساغر کی نگاہوں میں کھٹکتے ہیں ابھی تک
کجلائے ہوئے شام و سحر شہر میں تیرے



محبت کے مزاروں تک چلیں گے
ذرا پی لیں ستاروں تک چلیں گے

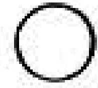
سنا ہے یہ بھی رسمِ عاشقی ہے
ہم اپنے غمگساروں تک چلیں گے

چلو تم بھی سفر اچھا رہے گا
ذرا اجڑے دیاروں تک چلیں گے

جوان زلفوں کے پرچم کھول دیجئے
مہکتے لالہ زاروں تک چلیں گے

جنوں کی وادیوں سے پھول چن کر
وفا کی راہ گزاروں تک چلیں گے

چلو ساغر کے نغمے ساتھ لے کر
چھلکتے جوئباروں تک چلیں گے



بھولی ہوئی صدا ہوں مجھے یاد کیجئے
تم سے کہیں ملا ہوں مجھے یاد کیجئے

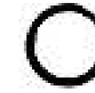
منزل نہیں ہوں، خضر نہیں، راہزن نہیں
منزل کا راستہ ہوں مجھے یاد کیجئے

میری نگاہِ شوق سے ہر گل ہے دیوتا
میں عشق کا خدا ہوں مجھے یاد کیجئے

نغموں کی ابتدا تھی کبھی میرے نام سے
اشکوں کی انتہا ہوں مجھے یاد کیجئے

گم سُم کھڑی ہیں دونوں جہاں کی حقیقتیں
میں اُن سے کہہ رہا ہُوں مجھے یاد کیجئے

ساغر کسی کے حُسنِ تغافل شعار کی
بہکی ہوئی ادا ہُوں مجھے یاد کیجئے



گُل کو شبنم سے آگ لگ جائے
مَوج کو رَم سے آگ لگ جائے

بزمِ تقدیس کی فضاؤں میں
حُسنِ برہم سے آگ لگ جائے

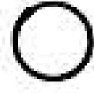
ایسے زخموں کو کیا کرے کوئی
جن کو مرہم سے آگ لگ جائے



کاش، اے زندگی کی رقاصہ
تری چھم چھم سے آگ لگ جائے

دل کی بے تاب آہٹوں میں ندیم
زلفِ برہم سے آگ لگ جائے

چاندنی کے سُہاگ میں ساغر
چشمِ پُرنم سے آگ لگ جائے



تغیّرات سے دُنیا سنگار کرتی ہے
یہ چاند توڑ کے جھُومر میں رنگ بھرتی ہے

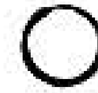
اُسی کلی سے ہے تاریخِ گلستاں روشن
جو باغباں کے لہُو سے ذرا نکھرتی ہے

جسے نہ زہرِ جنُوں کی ذرا سی چاٹ لگے
وُہ بے شعور محبّت ضرور مرتی ہے

دلوں کے بجھتے چراغوں کو نُور دیتی ہے
وہ تیرگی جو تری زُلف سے بکھرتی ہے

ہماری جنتِ تخیّل سے گزر جائے
بہار بن کے قیامت اگر گزرتی ہے

طلوعِ مہر ترے آستاں پہ ہوتا ہے
کرن کرن تری دہلیز پر اُترتی ہے



چراغِ طُور جلاؤ بڑا اندھیرا ہے
ذرا نقاب اُٹھاؤ بڑا اندھیرا ہے

وُہ جن کے ہوتے ہیں خورشید آستینوں میں
اُنہیں کہیں سے بُلاؤ بڑا اندھیرا ہے

مجھے تمہاری نگاہوں پہ اعتماد نہیں
مِرے قریب نہ آؤ بڑا اندھیرا ہے

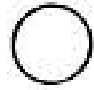
فرازِ عرش سے ٹوٹا ہُوا کوئی تارا
کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ۔ بڑا اندھیرا ہے

ابھی تو صبح کے ماتھے کا رنگ کالا ہے
ابھی قریب نہ آؤ بڑا اندھیرا ہے

بصیرتوں پہ اُجالوں کا خوف طاری ہے
مجھے یقین دِلاؤ بڑا اندھیرا ہے

جسے زبانِ خرد میں شراب کہتے ہیں
وُہ روشنی سی پلاؤ! بڑا اندھیرا ہے

بنامِ زہرہ جبینانِ خطۂ فردوس
کسی کرن کو جگاؤ! بڑا اندھیرا ہے



زخمِ دل پر بہار دیکھا ہے
کیا عجب لالہ زار دیکھا ہے

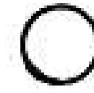
جن کے دامن میں کچھ نہیں ہوتا
اُن کے سینوں میں پیار دیکھا ہے

خاک اُڑتی ہے تیری گلیوں میں
زندگی کا وقار دیکھا ہے

تشنگی ہے صدف کے ہونٹوں پر
گُل کا سینہ فگار دیکھا ہے

ساقیا! اہتمامِ بادہ کر
وقت کو سوگوار دیکھا ہے

جذبۂ غم کی خیر، ہو ساغر
حسرتوں پر نکھار دیکھا ہے



تم نے جو چاہا وُہ دُنیا بن گئی
آگ تھی، پھُولوں کا گجرا بن گئی

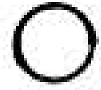
رات کچھ یُوں مائلِ نغمہ تھا دل
چاندنی سازِ تمنّا بن گئی

میرے جامِ مے سے اُڑ کر ایک چھینٹ
صُبح کے ماتھے کا قشقہ بن گئی

موج و دریا میں نہیں ہے فرق کچھ
موج لہرائی تو دریا بن گئی

جب کسی صُورت نہ عنواں مل سکا
آرزُو بے نام صحرا بن گئی

زندگی کی بات سُن کر کیا کہیں
اِک تمنّا تھی تقاضا بن گئی



موجیں ہیں اور بادہ گساروں کے قافلے
رقصاں ہیں مست مست کناروں کے قافلے

یُوں کاروانِ زیست رواں ہے کہ ساتھ ساتھ
رفتار میں ہیں بادہ گساروں کے قافلے

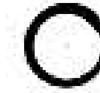
پلکوں پہ جم رہی ہے غمِ زندگی کی اوس
بانہوں میں سو گئے ہیں سہاروں کے قافلے

اِس عنبریں سی زُلفِ پریشاں کو دیکھ کر
بیتاب ہو گئے ہیں چناروں کے قافلے

رُک رُک کے آ رہی ہیں بہاروں کی نکہتیں
تھم تھم کے چل رہے ہیں نگاروں کے قافلے

محسوس ہو رہا ہے یہ پھُولوں کو دیکھ کر
گھبرا کے سو گئے ہیں شراروں کے قافلے

ہے صحنِ آرزُو میں لُٹی چاندنی کی دُھول
ساغرؔ چلے گئے مرے یاروں کے قافلے



عطا جسے ترا عکسِ جمال ہوتا ہے
وہ پھُول سارے گلُستاں کا لال ہوتا ہے

رہِ مجاز میں ہیں منزلیں حقیقت کی
مگر یہ اہلِ نظر کا خیال ہوتا ہے

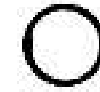
تلاش کرتی ہے سائے تمہارے آنچل کے
چمن میں بادِ صبا کا یہ حال ہوتا ہے

بہارِ فطرتِ صیّاد کی کہانی ہے
کہ اس کے دوش پہ پھُولوں کا جال ہوتا ہے

یہ واردات بھی اب دل پہ روز ہوتی ہے
مسرتوں میں بھی ہم کو ملال ہوتا ہے

یہ بکھرے بکھرے سے گیسُو، تھکی تھکی آنکھیں
کہ جیسے کوئی گلستاں نڈھال ہوتا ہے

جواب دے نہ سکیں جس کا دو جہاں ساغرؔ
کسی غریب کے دل کا سوال ہوتا ہے



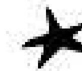
آنکھ روشن ہے جیب خالی ہے
ظلمتوں میں کرن سوالی ہے

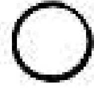
حادثے لوریوں کا حاصل ہیں
وقت کی آنکھ لگنے والی ہے

آئینے سے حضور ہی کی طرح
چشم کا واسطہ خیالی ہے

حسن پتھر کی ایک مورت ہے
عشق پھولوں کی ایک ڈالی ہے

موت اک انگبیں کا ساغر ہے
زندگی زہر کی پیالی ہے





وقت کی عمر کیا بڑی ہوگی
اک ترے وصل کی گھڑی ہوگی

دستکیں دے رہی ہے پلکوں پر
کوئی برسات کی جھڑی ہوگی

کیا خبر تھی کہ نوکِ خنجر بھی
پھول کی ایک پنکھڑی ہوگی

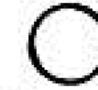
زلف بل کھا رہی ہے ماتھے پر
چاندنی سے صبا لڑی ہوگی

اے عدم کے مسافرو، ہشیار
راہ میں زندگی کھڑی ہوگی

کیوں گرہ گیسوؤں میں ڈالی ہے
جاں کسی پھول کی اڑی ہوگی

التجا کا ملال کیا کیجیے
اُن کے در پہ کہیں پڑی ہوگی

موت کہتے ہیں جس کو اے ساغرؔ
زندگی کی کوئی کڑی ہوگی



چمن میں غنچے کھلے ہوئے ہیں مگر نگارِ چمن نہیں ہے
نگاہ میں وسعتیں نہیں ہیں خیال میں بانکپن نہیں ہے

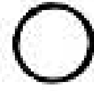
کبھی خرد کے جہاں سے گزرے کبھی جنوں کا نگر بسایا
ہیں بے نیازِ قیام و راحت ہمارا کوئی وطن نہیں ہے

ہماری حالت پہ رونے والو ہماری عادت پہ ہنسنے والو
تمہیں کوئی رنج ہو تو ہوگا، ہمیں تو کوئی محن نہیں ہے

تمہاری کاکل کا نام لے کر بہار پھولوں کو ڈس رہی ہے
غرورِ شبنم تو بھر اُٹھا ہے، وقارِ سرو و سمن نہیں ہے

حیا کے پہرے ہیں بازوؤں پر جبیں پہ آنچل کی حکمرانی
کوئی مہکتا ہوا تنفس، کوئی مچلتی کرن نہیں ہے

یہاں جو بڑھ کر اُٹھائے مینا، اُسی کا ساغر اُسی کی مینا
ہیں اپنے اپنے نصیب ساقی! کسی کا کوئی بچن نہیں ہے



کتنے غم، کتنے دُکھ اُبھر آئے
تیری یادوں نے پھول مہکائے

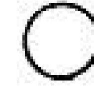
کون اُن بے وفا نگاہوں کو
دھڑکنوں کی زبان سمجھائے

تم نے اپنوں کی بات تک نہ سُنی
ہم نے غیروں کے درد اپنائے

اے نگارو! تمہاری بستی میں
راستہ بھول کر نکل آئے

عنبریں گیسوؤں کی اُلجھن نے
دو جہانوں کے راز اُلجھائے

ہم نے پھولوں کے واسطے ساغرؔ
خار زاروں میں ہاتھ پھیلائے



بدنامیٔ حیات سے رنجور ہو گئے
اَے یار! تیری بات سے رنجور ہو گئے

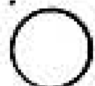
یزداں کے حادثات پہ ہم نے کیا یقیں
اپنی شکستِ ذات سے رنجور ہو گئے

مُرجھا کے رہ گئی غمِ دشنام کی بہار
فصلِ تکلّفات سے رنجور ہو گئے

ہر رہگذر پہ چُور ہیں انسانیت کے پاؤں
شیشے کی کائنات سے رنجور ہو گئے

اپنوں نے زندگی میں ہراساں کیا مجھے
غیروں کے التفات سے رنجور ہو گئے

ساغرؔ! سکون دے گئی دل کی کسک ہمیں
اکثر خوشی کی بات سے رنجور ہو گئے



جفا و جور کی دُنیا سنوار دی ہم نے
زہے نصیب کہ ہنس کر گزار دی ہم نے

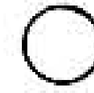
کلی کلی ہمیں حیرانیوں سے تکتی ہے
کہ پت جھڑوں میں صدائے بہار دی ہم نے

خیالِ یار کی رنگینیوں میں گُم ہو کر
جمالِ یار کی عظمت نکھار دی ہم نے

اُسے نہ جیت سکے گا غمِ زمانہ اب
جو کائنات ترے در پہ ہار دی ہم نے

وہ زندگی کہ جسے زندگی سے نسبت تھی
تمہاری زلفِ پریشاں پہ وار دی ہم نے

کچھ ایسا سرد ہُوا جذبۂ وفا ساغر
خود اپنی ذات کو ہنس ہنس کے خار دی ہم نے



حاضر شراب و جام ہیں تو جاگ تو سہی
الطاف خاص و عام ہیں تو جاگ تو سہی

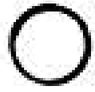
ہیں اختیارِ شوق میں تاروں کی منزلیں
بھٹکے ہوئے مقام ہیں تو جاگ تو سہی

کانٹے بھی ایک چیز ہیں تو دیکھ تو سہی
گُل بھی شرارہ فام ہیں تو جاگ تو سہی

ان شب کی ظلمتوں میں کہیں آس پاس ہی
صُبحوں کے اہتمام ہیں تو جاگ تو سہی

افسردگی گناہ کی تمثیل ہے ندیم
بے چینیاں حرام ہیں تو جاگ تو سہی

ساغر! قریب تر ہے دیارِ مہ و نجوم
بس اور چند گام ہیں تو جاگ تو سہی



حادثے کیا کیا تمہاری بے رُخی سے ہو گئے
ساری دُنیا کیلئے ہم اجنبی سے ہو گئے

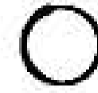
گردشِ دوراں، زمانے کی نظر، آنکھوں کی نیند
کتنے دشمن ایک رسمِ دوستی سے ہو گئے

کچھ تمہارے گیسوؤں کی برہمی نے کر دیئے
کچھ اندھیرے میرے گھر میں روشنی سے ہو گئے

یُوں تو، ہم آگاہ تھے صیّاد کی تدبیر سے
ہم اسیرِ دامِ گُل اپنی خوشی سے ہو گئے

بندہ پرور! کھُل گیا ہے آستانوں کا بھرم
آشنا کچھ لوگ رازِ بیخودی سے ہو گئے

ہر قدم ساغرؔ! نظر آنے لگی ہیں منزلیں
مرحلے کچھ طے مری آوارگی سے ہو گئے



تڑپ کر سوزِ دل کو جلوہ ساماں کر لیا میں نے
بہت بے نور تھی دنیا چراغاں کر لیا میں نے

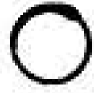
خدا رکھے یہ طرزِ جور باقی تم نہ شرماؤ
اب اپنی آرزوؤں کو پشیماں کر لیا میں نے

اُٹھا کر چوم لی ہیں چند مرجھائی ہوئی کلیاں
نہ تم آئے تو یوں جشنِ بہاراں کر لیا میں نے

کسی کے اک تبسم پر اساسِ زندگی رکھ لی
شراروں کو نشیمن کا نگہباں کر لیا میں نے

ابھی تک بے کفن سی ہے مری وحشت کی عُریانی
یہ کس امید پر گھر کو بیاباں کر لیا میں نے

کبھی ساغرؔ بکف میں وجد میں آیا جو لہرا کر
تو اپنے ساتھ دُنیا کو بھی رقصاں کر لیا میں نے



مرے چمن میں بہاروں کے پھُول مہکیں گے
مجھے یقیں ہے شراروں کے پھُول مہکیں گے

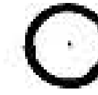
کبھی تو دیدۂ نرگس میں روشنی ہوگی
کبھی تو اُجڑے دیاروں کے پھُول مہکیں گے

تمہاری زلفِ پریشاں کی آبرو کے لئے
کئی ادا سے چناروں کے پھُول مہکیں گے

چمک ہی جائے گی شبنم لہو کی بوندوں سے
روش روش پہ ستاروں کے پھُول مہکیں گے

ہزاروں موجِ تمنا صدف اُچھالے گی
تلاطموں سے کناروں کے پھول مہکیں گے

یہ کہہ رہی ہیں فضائیں بہار کی ساغر
جگر فروز اشاروں کے پھول مہکیں گے



ذوقِ طغیاں میں ڈھل کے دیکھ کبھی
موج بن کر اُچھل کے دیکھ کبھی

تو صدف ہے تو اس سمندر میں
سنگریزے نگل کے دیکھ کبھی

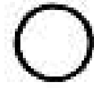
آتشِ آرزو عجب شئے ہے
اس کی ٹھنڈک میں جل کے دیکھ کبھی

خشک صحرا بھی رشکِ گلشن ہے
اپنے گھر سے نکل کے دیکھ کبھی

اے گرفتارِ رہبر و منزل
بے ارادہ بھی چل کے دیکھ کبھی

زندگی کی مٹھاس کے ہمراہ
زہرِ غم کو نگل کے دیکھ کبھی

ہے بہاروں کی جستجو ساغر
خارزاروں میں چل کے دیکھ کبھی



قیدِ تصورات میں مدت گزر گئی
ساقی غمِ حیات میں مدت گزر گئی

مجھ کو شکستِ جام کے نغموں سے واسطہ
میخانۂ ثبات میں مدت گزر گئی

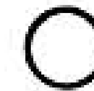
کچھ بھی نہیں ہے گیسوئے خمدار کے سوا
تفسیرِ کائنات میں مدت گزر گئی

پابندِ حرف دار و رسن داستانِ شوق
عرض و گزارشات میں مُدّت گزر گئی

رُوٹھے تو اور بن گئے تصویرِ التفات
کیفِ نوازشات میں مُدّت گزر گئی

ہر حادثہ حیات کی رُوداد بن گیا
دنیائے حادثات میں مُدّت گزر گئی

ساغرؔ کہاں مجال کہ آنکھیں ملائیں، ہم
رسوائیاں ہیں گھات میں مدّت گزر گئی



بازار آرزو کی نوا دام چڑھ گئے
ہر چیز قیمتوں سے سوا دام چڑھ گئے

ہے غازۂ بہار سے محروم ان دنوں
مخمور گیسوؤں کی گھٹا دام چڑھ گئے

اب قرضِ مئے بحال ہو مشکل سے دوستو
کہتی ہے میکدے کی فضا دام چڑھ گئے

بے چین سُرخ سُرخ لبوں کی فصاحتیں
ہیں نکہتوں سے رنگ خفا دام چڑھ گئے

مریخ اور زہرہ کی قیمتوں کے نام
ذرّوں نے مُسکرا کے کہا دام چڑھ گئے

ہر ماہ لُٹ رہی ہے غریبوں کی آبرو
چڑھنے لگا ہلالِ قضا دام چڑھ گئے

اَے وقت تجھ کو غیرتِ انساں کی بھیک دے
روٹی میں بِک گئی ہے ردا دام چڑھ گئے

ہے احتسابِ زیست کی لٹکی ہوئی صلیب
ہر روز جیسے روزِ جزا دام چڑھ گئے

نقدِ خرد سرُور تمنّا کا مُول ہے
ارماں کا رنگ زرد ہوا دام چڑھ گئے

○

کوئی تتلی ہے نہ جگنو آہ شامِ بیکسی
آج دِل میں نسترن کی شاخ پھر چبھنے لگی

تُو نے کیا توڑا گلستاں سے وفا کا ایک پھول
ہر کلی ہے غیر محرم ہر شگوفہ اجنبی

بے ارادہ چل رہا ہوں زندگی کی راہ پر
میرے مسلک میں نہیں ہے کاروبارِ رہبری

جس میں کچھ انسان کی توقیر کے احکام تھے
وہ شریعت معبدوں کے زیرِ سایہ سو گئی

آگئیں بازار میں بکنے خدا کی عظمتیں
جی اُٹھی ہیں خواہشیں اور مر گیا ہے آدمی

میں شعاعوں میں پگھل جاؤں مری فطرت نہیں
وہ ستارہ ہوں کہ جس کو ڈھونڈتی ہے روشنی

اور کتنی دُور ہیں ساغرؔ عدم کی منزلیں
زندگی سے پُوچھ لوں گا راستے میں گر ملی

○

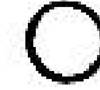
ہوا مہکی مہکی فضا بھیگی بھیگی
چلو آج مانگیں دُعا بھیگی بھیگی

کسی کی بہکتی ہوئی تشنگی نے
بہاروں کو دے دی سزا بھیگی بھیگی

گھٹاؤں کو رحمت کی جوش آگیا ہے
کوئی ہوگئی ہے خطا بھیگی بھیگی

ذرا صندلیں ہاتھ نزدیک لاؤ
سُلگنے لگی ہے حنا بھیگی بھیگی

حِصارِ تمنّا میں دم گھٹ رہا ہے
ذرا چھیڑ مطرب نوا بھیگی بھیگی



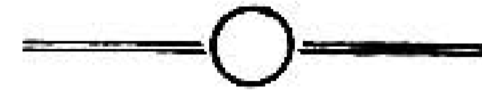
میرے تصورات ہیں تحریریں عشق کی
زندانیٔ خیال ہوں زنجیریں عشق کی

تعبیرِ حسن ہے دلِ مجروح کا لہو!
چھینٹے پڑے تو بن گئیں تصویریں عشق کی

داغِ فراق، زخمِ وفا، اشکِ خوں فشاں
روزِ ازل سے ہیں یہی جاگیریں عشق کی

شامِ خزاں کو صبحِ بہاراں بنا دیا
ترتیبِ زیست بن گئیں تعبیریں عشق کی

ساغر جہانِ شوق میں دیکھی ہیں جاوداں
اہلِ نظر کے سامنے تفسیریں عشق کی

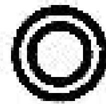


تلخیاں

معہ

طویل نظم پرچھائیاں اور تازہ کلام

ساحر لدھیانوی



خیام پبلشرز
چوک اردو بازار ——— لاہور



خیام پبلشرز

چوک اُردو بازار۔ لاہور ۲

- **دیوانِ جگر** : رئیس المتغزلین حضرت جگر مرادآبادی کی شاعری کا نچوڑ
- **دیوانِ ظفر** : آخری مغل تاجدار کی رُلا دینے والی غزلیں۔
- **دیوانِ ذوق** : صفائی زبان اور پاکیزگیٔ خیال کی شاعری۔
- **دیوانِ درد** : تصوف کی چاشنی سے مملو غزلیں۔
- **دیوانِ میر** : غزل کے سب سے بڑے شاعر کا کلام۔
- **دیوانِ داغ** : چلبلے شاعر کی چلبلی غزلیں۔
- **دیوانِ ساغرِ صدیقی** : درویش خدامست کی مشہور و مقبول غزلیں۔
- **دیوانِ آتش** : بانکے غزل گو کی دل میں اُتر جانے والی غزلیں۔
- **دیوانِ مومن** : عاشقانہ شاعری کے دلدادگان کے لیے خاص الخاص تحفہ۔

خیام پبلشرز، چوک اُردو بازار۔ لاہور